www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

February 2009 • No. 387

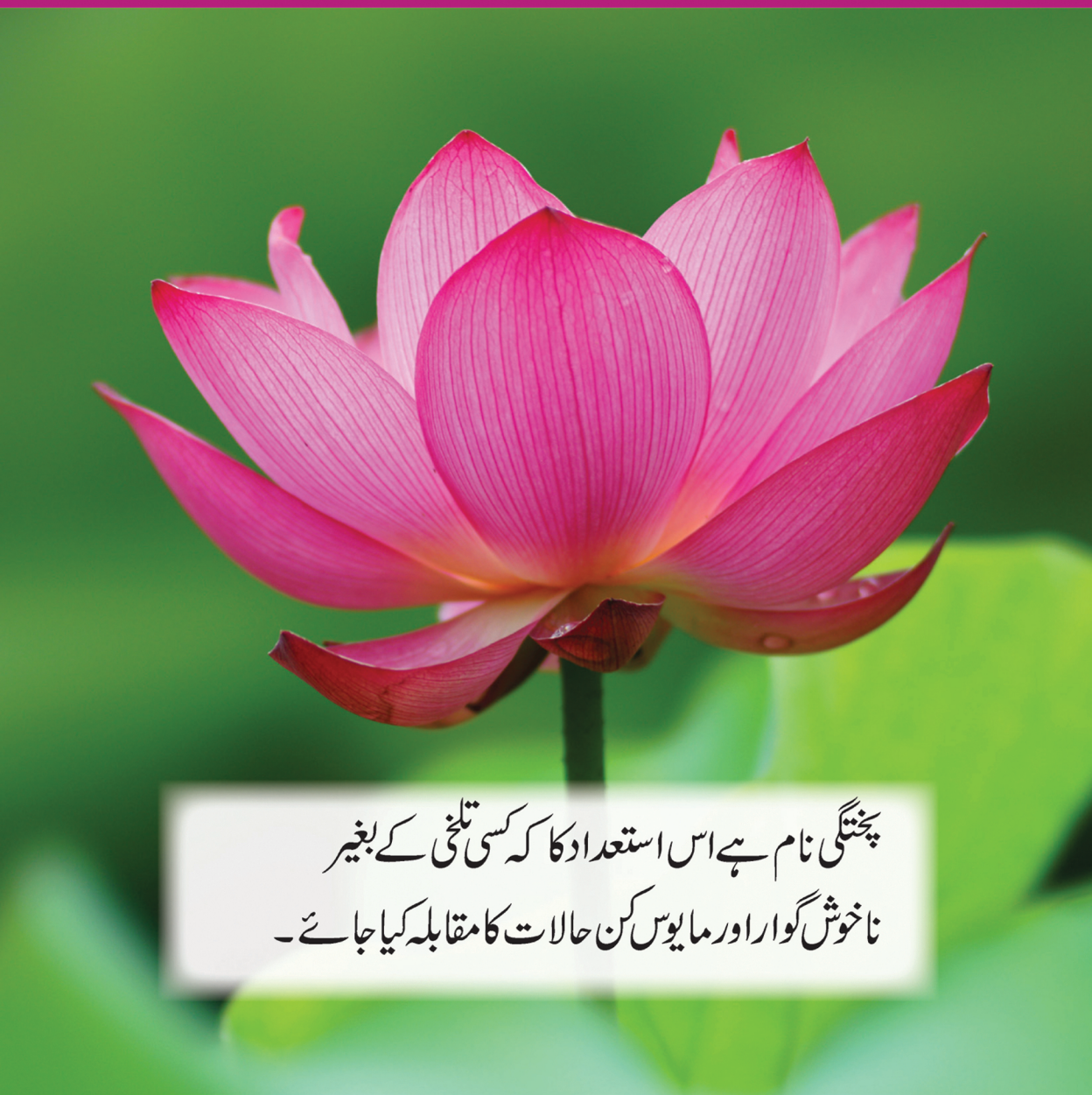

پختگی نام ہے اس استعداد کا کہ کسی تلخی کے بغیر
ناخوش گوار اور مایوس کن حالات کا مقابلہ کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فروری 2009

قبرص کا سفر

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 250
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

قبرص کا سفر

اٹلی میں ویٹکن (Vatican) کی سرپرستی میں ایک مسیحی تنظیم قائم ہے۔ اس کا نام کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو (Community of St. Egidio) ہے۔ وہ 1968 میں قائم ہوئی۔ اُن کی طرف سے مجھ کو دعوت نامہ ملا۔ اِس میں مجھ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ کانفرنس قبرص (Cyprus) میں 18-16 نومبر 2008 کو ہوئی۔ یہ کانفرنس کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو اور سائپرس چرچ (Church of Cyprus) کے مشترک تعاون سے کی گئی۔

اِس سے پہلے اگست 2008 میں اس تنظیم کے ارکان پر مشتمل 20 افراد کا ایک وفد دہلی آیا تھا۔ وہ لوگ ہمارے مرکز میں بھی آئے اور ان سے اسلام اور امن کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اُن میں سے ہر ایک کو اسلامی لٹریچر دیا گیا۔ دعوت نامے کے بعد بار بار ای میل اور ٹیلی فون پر ان کے پیغامات ملتے رہے۔ تاہم میں فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ مجھ کو وہاں جانا چاہیے، یا نہیں۔ آخر کار ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھ کو مختصر طور پر معلوم تھا کہ قبرص (Cyprus) میں ایک صحابیہ کی قبر ہے، لیکن اس کی تفصیل میرے ذہن میں نہ تھی۔ مثلاً حیاۃ الصحابہ میں امِّ حرام بنت ملحان کے تذکرہ کے تحت حاشیہ میں یہ مختصر جملہ میں نے پڑھا تھا: **دُفنت أمّ حرام بنت مِلْحان فی قُبْرُص، ویسمّی قبرها هناک "قبر المرأة الصالحة"** (جلد 1، صفحہ 592)۔ میرے ایک ساتھی کو اِس کا علم ہوا تو انھوں نے اِس صحابیہ کے بارے میں تاریخی تفصیل انٹرنیٹ کے ذریعہ فراہم کر دی۔ اِس میں صحابیہ کے اُس مقبرے کی تصویر بھی شامل تھی جو بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) کے ساحل پر واقع ہے۔ فطری طور پر میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں قبرص کا سفر کروں اور صحابیہ کی قبر کو دیکھوں۔ چناں چہ کانفرنس کے منتظمین کو کنفرمیشن کی اطلاع دے دی گئی۔ میرا یہ سفر ایک قافلے کی صورت میں ہوا۔ میرے ساتھ اِس سفر میں میرے دو رفیق بھی شامل تھے — مولانا محمد ذکوان ندوی، مسٹر رجت ملہوترا۔

قبرص (Cyprus) ایک جزیرہ ہے۔ اُس کا رقبہ 9,251 مربع کلومیٹر ہے۔ وہ بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) کے درمیان اس کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ تین براعظموں کے قریب ہے— ایشیا، افریقہ، یورپ۔ قبل مسیح زمانے میں اس پر یونانیوں کی حکومت تھی، پھر یہاں رومیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد یہاں ترکوں کی حکومت آئی۔ اس کے بعد یہ جزیرہ برطانیہ کے زیر اقتدار آیا۔ اب قبرص کے دو حصے ہیں۔ اس کے 60 فی صد حصے پر مسیحیوں کی حکومت ہے، اور تقریباً 40 فی صد حصے پر ترکوں کی حکومت۔ یہاں کی زبان یونانی اور ترکی ہے۔ لیکن انگریزی زبان بھی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

برٹش انسائکلو پیڈیا میں قبرص کے بارے میں جو تفصیل ہے، اس کا ایک جُزیہ ہے کہ— سکندر اعظم نے جب 333 قبل مسیح میں قبرص پر قبضہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے عام طور پر اس کا استقبال کیا:

After the victory of Alexander the Great at Issus in 333, all the states of Cyprus welcomed the conqueror (EB 5/406)

یہ الفاظ دنیا کی سیاسی تاریخ کے ایک خاص پہلو کو بتاتے ہیں۔ مختلف حکم رانوں کے بارے میں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جب وہ کسی ملک میں بطور فاتح داخل ہوئے تو مفتوح قوم نے خوشی کے ساتھ اُن کا استقبال کیا۔ اِس قسم کے بیانات مسلم تاریخ میں بھی مسلم فاتحین کے بارے میں بار بار ملتے ہیں۔ اِس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ قدیم حکم راں کے مقابلے میں نئے حکم راں زیادہ بہتر تھے۔ اِس کا تعلق انسان کے اُس عام مزاج سے ہے جس کو تبدیلی (change) کہا جاتا ہے۔ موجودہ امریکی صدر براک اوباما جب نومبر 2008 میں امریکا کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے شکاگو میں اپنی پہلی پبلک تقریر اِن الفاظ سے شروع کی:

Change has come to America.

اِن الفاظ کو سن کر حاضرین نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ یہ تالیاں پرو اوباما سے زیادہ، اینٹی بش جذبات کا اظہار تھیں۔ اِسی کو جدید اصطلاح میں اینٹی انکمبنسی فیکٹر (anti incumbency factor) کہا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اپنے حکم رانوں کے بارے میں بڑھی ہوئی توقعات

(over-expectations) میں مبتلا رہتے ہیں۔ کوئی حکم راں اِن توقعات کو پورا نہیں کر پاتا۔ اِس لیے لوگ اپنے موجودہ حکم راں کے بارے میں ہمیشہ شکایت کے جذبات لیے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو نیا حکم راں آتا ہے، وہ خوش نما الفاظ بولتا ہے۔ اِس بنا پر لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نیا حکم راں اُن کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔ مگر تجربے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ اب وہ دوبارہ موجود حکم راں کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

مسیحی حضرات کے نزدیک قبرص کی خصوصی اہمیت ہے۔ مشہور مسیحی مبلغ سینٹ پال (وفات: 65ء) نے قبرص کا سفر کیا۔ اُن کی تبلیغ سے برناباس (وفات: 61ء) نے مسیحیت قبول کی۔ برناباس کی پیدائش قبرص میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے قبرص میں مسیحیت پھیل گئی۔ برناباس کا مقبرہ شمالی قبرص کے قدیم شہر سلامی (Salamis) میں واقع ہے۔ موجودہ قبرص میں مسیحیوں کی تعداد تقریباً 80 فی صد ہے، اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً 20 فی صد۔

15 نومبر 2008 کو مجھے دہلی سے قبرص کے لیے روانہ ہونا تھا۔ عجیب بات ہے کہ آج ہی صبح کے اخبارات میں یہ خبر آئی کہ انڈیا کا راکٹ چندریان-1، 24 دن کے اندر تقریباً 4 لاکھ کلومیٹر کا سفر کرکے چاند کی قریبی فضا میں پہنچ گیا۔ وہاں اُس نے مون امپیکٹ پروب (Moon Impact Probe) کو چاند کی سطح پر اتار دیا۔ اِس طرح، انڈیا دنیا کا چوتھا ملک بن گیا جس نے مشینی طور پر چاند تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اِس واقعے کی رپورٹ تمام اخبارات میں چھپی ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (15 نومبر 2008) میں اِس خبر کا عنوان اِن الفاظ میں قائم کیا گیا ہے:

Kalam's Brainchild Lands on Moon.

اِس عنوان میں مسلم سائنس داں ڈاکٹر عبدالکلام کے رول کا غیر معمولی اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن اخبار کے کارٹونسٹ جگ ثریا اور نیلبھ نے اِس واقعے میں ایک مزاحیہ پہلو دریافت کرلیا۔ مذکورہ اخبار میں خبر کے ساتھ اُن کا ایک کارٹون چھاپا گیا ہے۔ اِس کارٹون کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

India has planted its tricolour on the moon. Isn't it great. It is great. It would be even greater if we could get China's permission to plant the Indian tricolour in Arunachal Paradesh. (p. 13)

انسان کا ذہن بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ ایک خالص سائنسی واقعے میں مزاح کا پہلو نکال سکتا ہے۔

قبرص کے لیے ہمارا سفر 15 نومبر 2008 کی شام کو شروع ہوا۔ ایک قدیم مثل ہے: **السفر کالسَّقَر**۔ اِسی کے لیے فارسی میں مثل ہے — سفر نمونۂ سقر، یعنی سفر جہنم کی مانند ہے۔ یہ مثل سفر کا حقیقی تعارف نہیں۔ سفر میں بہر حال مسائل پیش آتے ہیں، پہلے زمانے میں بھی اور آج بھی۔ لیکن سفر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سفر میں نئے نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تجربات ذہنی ارتقاء کے لیے بے حد قیمتی ہیں۔ اگر سفر میں مشکلات پیش آئیں تو اِن قیمتی تجربات میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔

15 نومبر 2008 کی شام کو 6 بجے ائرپورٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ راستے میں کاروں کا ہجوم دکھائی دیا۔ کاریں مسلسل دوڑ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ ہوائی جہاز کے لیے میرا پہلا سفر 1971 میں ہوا تھا۔ اُس وقت دہلی کی سڑکوں پر بہت کم کاریں دکھائی دیتی تھیں۔ آج ہر طرف موٹر کاریں دوڑتی ہوئی

نظر آتی ہیں۔ ایک عام آدمی اِس کو ترقی کی علامت بتائے گا۔ میں نے جب سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاروں کا ہجوم دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قیامت قریب آ گئی ہے، اور خدا نے فرشتوں کو حکم دے دیا ہے کہ لوگوں کو تیزی سے میدانِ حشر کی طرف لے آؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کو سچائی کی دریافت ہوگئی ہو، اس کو قیامت اتنی قریب نظر آئے گی کہ وہ آندھی اور طوفان کو دیکھے گا تو سمجھے گا کہ آنے والی قیامت شاید آ گئی۔ وہ سڑکوں پر لوگوں کی دوڑ کو دیکھے گا تو وہ سمجھے گا کہ شاید تمام لوگ فائنل کال کی طرف تیزی سے چلے جا رہے ہیں۔ حساس آدمی قیامت کو بالکل قریب دیکھنے لگتا ہے اور جو آدمی بے حس ہو، وہ اِس طرح رہے گا جیسے قیامت یا تو آئے گی نہیں، یا اس کے آنے میں ابھی بہت زیادہ دیر ہے۔ عجیب بات ہے کہ آج مسلمانوں کی نفسیات یہی ہے۔

مشہور مثل ہے کہ — چیزیں تقابل کے ذریعے سمجھ میں آتی ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے: **تُعرف الأشياء بأضدادها**۔ یہی مثل انگریزی زبان میں اِس طرح ہے:

In comparision that we understand.

ہمارا سفر شروع ہوا تو مجھے یہ مثل یاد آئی۔ میں نے اپنے سفر کا تقابل حیوانات کے سفر سے کیا۔ حیوانات بھی محدود طور پر سفر کرتے ہیں، لیکن ان کا سفر خود اپنے پیروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اِس کے برعکس، انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا سفر سواریوں کے ذریعے طے ہوتا ہے، خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی اور فضا میں بھی۔ انسان کے ساتھ خدا کا یہی خاص معاملہ ہے جس کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **ولقد كرّمنا بنى آدم، وحملناهم فى البر والبحر** (الإسراء: 70) اِس آیت کے اندر صرف بر و بحر کے سفر کا ذکر ہے۔ لیکن توسیعی معنیٰ میں اِس کے اندر فضائی سفر بھی شامل ہے۔

میں اپنے مزاج کے مطابق، ایک تنہائی پسند آدمی ہوں۔ ایک بیرونی سفر میں ایک عرب شیخ سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ: **أنا رجل أحبّ العُزلة**۔ اپنے اِس مزاج کی بنا پر میں ہمیشہ اپنی تنہائی کی دنیا میں جیتا ہوں۔ اِس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جب بھی مجھے کوئی سفر پیش آتا ہے تو اپنے اِس مزاج کی بنا پر مجھ کو ہمیشہ سفر کے لیے نکلتے ہوئے ایک قسم کی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ یہی موجودہ سفر

میں بھی پیش آیا۔ مگر جب میں ائر پورٹ پر پہنچا تو سارا معاملہ بالکل بدل چکا تھا۔ ائر پورٹ میں داخل ہوتے ہی آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک عالمی قافلے کے پُر ہجوم سفر میں شریک ہوگئے ہیں۔ آپ ایک بھیڑ کے درمیان معلوم یا نامعلوم منزل کی طرف چلے جارہے ہیں۔

ہم لوگ ائرپورٹ کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ائر پورٹ کا وہ حصہ دکھائی دیا جہاں روشن لفظوں میں ڈیوٹی فری شاپ (Duty Free Shop) لکھا ہوا تھا۔ عربی میں اس کو "السّوق الحُرّة" کہا جاتا ہے۔ یہ ائر پورٹ کا شاپنگ سنٹر تھا۔ خوب صورت الماریوں میں آئٹم برائے فروخت رکھے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی مسٹر رجت ملہوترا نے اس کو دیکھ کر کہا:

That area is no-angel zone.

اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مشن میں جو لوگ تیار ہورہے ہیں، ان کا ذوق کیا ہے۔ چیزوں کو دیکھنے کے معاملے میں ان کا زاویۂ نظر بالکل بدل گیا ہے۔ عام لوگ چیزوں کو مادّی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اِس کے برعکس، ہمارے مشن سے وابستہ افراد چیزوں کو روحانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہر چیز سے روحانی سبق حاصل کرتے ہیں۔

نئی دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائر پورٹ پر ہم لوگ انتظار گاہ (lounge) میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دونوں ساتھی لوگوں کو دعوتی لٹریچر دے رہے تھے۔ میرے ایک ساتھی نے ایک تعلیم یافتہ خاتون کو انگریزی میں چھپا ہوا دعوتی لٹریچر دیا۔ یہ خاتون شمالی امریکا کے ملک پیرو (Peru) کی رہنے والی تھیں۔ انھوں نے نہایت خوشی سے اس کو لیا۔ لینے کے بعد انھوں نے اپنے بیگ کے اندر سے ایک چھوٹا پرس نکالا۔ یہ پرس انڈین سکّوں سے بھرا ہوا تھا۔ مذکورہ خاتون نے میرے ساتھی کی طرف یہ سکّے بڑھاتے ہوئے کہا: لٹریچر کی کتنی قیمت دینا ہے (How much?)۔ میرے ساتھی نے کہا— یہ آپ کے لیے فری اسپرچول گفٹ ہے:

This is a free spiritual gift for you.

دہلی سے قبرص کے لیے ہمارا یہ سفر ایمرٹس (Emirates) کی فلائٹ (EK 515) کے

ذریعے ہوا۔ ایمرٹس ائرلائن نہایت معیاری ائرلائن ہے۔ اس کا کرایہ دوسرے جہازوں سے کافی زیادہ ہوتا ہے۔ ایمرٹس ائرلائن 1985 میں شروع ہوئی۔ اس کی اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اس کو 300 انٹرنیشنل ایوارڈ مل چکے ہیں۔ دبئی سے اس کی پروازیں دنیا کے تقریباً 100 مقامات پر جاتی ہیں۔ اب دبئی میں صرف ایمرٹس ائرلائنز کے لیے ایک مستقل ائرپورٹ بنایا جارہا ہے۔

ہم لوگ جہاز کے اندر داخل ہوئے تو اس کے اندر تمام انتظامات شاہانہ معیار کے نظر آئے۔ سفر کے دوران تمام سہولتیں اعلیٰ سطح پر موجود تھیں۔ دہلی سے دبئی کا سفر تقریباً 4 گھنٹے کا تھا۔ یہ پورا سفر جس طرح طے ہوا، وہ حدیث کے الفاظ میں "**کالملوك علی الأسِرّة**" کا تجربہ کرارہا تھا۔ تاہم ایک مسئلہ میرے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ دبئی سے ہم کو لارناکا (Larnaca) کے لیے اگلی پرواز لینا تھا۔ دبئی میں یہ وقفہ 8 گھنٹے کا تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق، میں فکرمند تھا کہ اتنا لمبا وقت ائرپورٹ پر کیسے گزرے گا۔ لیکن ائرپورٹ پر پہنچتے ہی بالکل نیا منظر سامنے آیا۔ ائرپورٹ پر میرے لیے سینئر سٹی زن ہونے کی بنا پر وہیل چیئر موجود تھی۔ ائرپورٹ کا کارکن تیزی سے چلاتے ہوئے ہم کو ائرپورٹ کے لاؤنج (lounge) میں لے گیا۔ رسپشن پر حسب قاعدہ ہماری انٹری کی گئی۔ اس کے بعد ہم تینوں لوگ لاؤنج میں داخل ہوئے۔

اگلی فلائٹ کے وقفۂ انتظار کے لیے بنایا گیا یہ لاؤنج نہایت کشادہ تھا۔ وہ بالکل جدید طرز پر بنایا گیا تھا۔ اُس میں بیٹھنے اور لیٹنے کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ اِسی کے ساتھ اس کے اندر کھانے اور پینے کے اعلیٰ انتظامات تھے۔ مختلف قسم کے مشروبات اور ہر ذوق کے کھانے وہاں افراط کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ ہم لوگوں نے یہاں بڑھے ہوئے جذباتِ شکر کے ساتھ نماز پڑھی۔

یہ لاؤنج (lounge) لمبائی کی صورت میں تھا۔ اس کے دونوں طرف کی دیواروں میں نہایت شفاف قسم کے بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہ شیشے ساؤنڈ پروف تھے۔ باہر ہوائی جہاز مسلسل پرواز کررہے تھے اور اتر رہے تھے، لیکن ان کا شور ہم لوگوں تک نہیں پہنچتا تھا۔ ہم باہر کے مناظر بخوبی طور پر دیکھتے تھے، لیکن باہر کے شور سے ہم پوری طرح محفوظ تھے۔ یہ ایک وسیع اور صاف ستھری دنیا تھی۔ اس کے اندر کھانے پینے سے لے کر ضرورت کی تمام چیزیں اپنی اعلیٰ صورت میں موجود تھیں۔ ہم جہاں چاہیں،

بیٹھیں اور جہاں چاہیں لیٹیں، اور اپنی پسند کے مطابق جو چاہیں کھائیں یا پئیں۔ مزید یہ کہ ٹیلی فون کے ذریعے ہم کسی بھی مقام پر کسی بھی شخص سے فوری طور پر ربط قائم کر سکتے تھے۔

یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ اِس تجربے کے دوران قرآن کی دو آیتیں یاد آئیں: **وإذا رأیتَ ثَمّ رأیتَ نعیماً وملکاً کبیراً** (الدھر: 20) یعنی تم جہاں دیکھو گے، وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔ اور: **نتبوّأ من الجنّة حیث نشاء** (الزّمر: 74) یعنی ہم جہاں چاہیں، جنت میں مقام کریں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موجود دنیا جنت کا ابتدائی تعارف ہے (البقرة: 25)۔ چناں چہ یہ جگہ اپنی مذکورہ خصوصیات کی بنا پر ہمارے لیے جنت کا ایک ابتدائی تعارف بن گئی۔ ہم سب کے دل سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، ہمیں اِس آیت کا مصداق بنا دے: **ویدخلهم الجنّة عرّفها لهم** (محمد: 6) یعنی خدا اُن کو جنت میں داخل کرے گا جس کی اُنھیں پہچان کرا دی ہے۔

جنت مومن کے لیے ایک معلوم چیز ہے۔ مومن اپنی بڑھی ہوئی معرفت کے ذریعے جنت کا تصوراتی ادراک کر لیتا ہے۔ وہ فطرت کے حسین مناظر میں جنت کی ابتدائی جھلکیاں دیکھ لیتا ہے۔ غیب میں چھپی ہوئی جنت کا یہی گہرا ادارک ہے جو آدمی کو یہ حوصلہ دیتا ہے کہ وہ قربانی کی قیمت پر اُس کا طالب بن سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کوئی شخص آج کی دنیا کو قربان کر کے کل کی جنت کا طالب نہ بنے۔

دبئی کا یہ ائرپورٹ کئی منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ اُس کی مختلف منزلوں پر مسافروں کے لیے الگ الگ تین مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ ایک، عورتوں کے لیے اور دو مردوں کے لیے۔ ہر مسجد ایک کشادہ کمرے پر مشتمل تھی۔ اس کے باہر کے ایک حصے میں وضو کا انتظام تھا۔ یہاں گیٹ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے — **المصلّیٰ** (Prayer Room)۔ ہمارے ساتھیوں نے اِن مسجدوں میں قرآن کے انگریزی ترجمے کا ایک ایک نسخہ مسافروں کے مطالعے کے لیے رکھ دیا — دبئی ائرپورٹ پر ہمارا قیام بظاہر برائے استراحت تھا، لیکن عملاً وہ ہمارے لیے دعوت کا ایک نیا میدان بن گیا۔ میرے ساتھیوں نے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور اُنھیں اسلامی لٹریچر پڑھنے کے لیے دیا۔

ائرپورٹ پر اور بھی کئی قسم کے تجربات ہوئے۔ مثلاً ائرپورٹ کے ایک نوجوان کارکن سے

ملاقات ہوئی۔ وہ انڈیا کا رہنے والا تھا۔ میرے ساتھی نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ یہاں خوش ہیں۔ اُس نے منفی انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ اِن لوگوں نے مجھ کو یہاں ایک اور کام کے نام پر بلایا تھا اور آنے کے بعد انھوں نے مجھ کو دوسرا کام دے دیا۔ اِس واقعے کو جنرلائز کیجیے تو اِس میں تمام انسانوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر عورت اور مرد شکایت میں جی رہے ہیں۔ کیوں کہ ہر ایک نے اپنی توقعات (expectations) کو غیر واقعی طور پر بڑھا رکھا ہے۔ اِس لیے جو کچھ اُس کو ملتا ہے، وہ اس کو اپنی توقع سے کم نظر آتا ہے۔ اِس مزاج نے موجودہ زمانے کے لوگوں کو سب سے بڑی نعمت سے محروم کر رکھا ہے، اور وہ ہے شکرِ خداوندی کی نعمت۔

16 نومبر 2008 کی صبح کو ساڑھے دس بجے ہم ایمرٹس ائرلائن کی اگلی فلائٹ (EK-107) میں سوار ہوئے۔ یہ جہاز دبئی سے لارناکا (Larnaca) کے لیے جا رہا تھا۔ اِس جہاز کے اندر بدستور اُسی طرح شاہانہ انتظامات تھے جس کا نمونہ ہم نے پچھلے جہاز میں دیکھا تھا۔

جہاز میں 16 نومبر کے مختلف اخبارات مطالعے کے لیے موجود تھے۔ ایک اخبار میں ایک خبر کی سرخی یہ تھی — انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کی طرف سے پاکستان کو سات بلین ڈالر سے زیادہ قرض:

Pak gets $ 7.6 billion loan from IMF.

خبر میں بتایا گیا تھا کہ عالمی مالیاتی ادارہ اس پر راضی ہو گیا ہے کہ وہ سات بلین ڈالر سے زیادہ کی رقم پاکستان کو بطور قرض دے۔ اِس قرض کا مقصد پاکستان کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ اپنے پچھلے قرضوں کو ادا کر سکے اور اِس طرح مالیاتی ادائگی کے معاملے میں وہ عہد شکن (defaulter) ملک قرار پانے سے بچ جائے:

The International Monetary Fund (IMF) has "in principle" agreed to extend a credit of $7.6 billion to Pakistan to stabilize its ailing economy and help it avoid defaulting on foreign debt repayments, the government said on Saturday. "Pakistan would get $4.6 billion this month while the remaining $3 billion would be disbursed next year," Pakistan's advisor on finance Shaukat Tarin said. Tarin said the credit facility will be for two years under a standby arrangement. "The facility has been obtained to strengthen the country's foreign exchange reservoirs and it will not be utilized to bailout the stock market".

اِس خبر کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ موجودہ زمانے میں دو ملک ایسے تھے جو مذہبی نعرہ پر بنے— اسرائیل اور پاکستان۔ اسرائیل کا نعرہ زائن ازم تھا، اور پاکستان کا نعرہ اسلام ازم۔ مگر اقتصادی اعتبار سے دونوں کا انجام ایک ہی ہوا، وہ یہ کہ دونوں خود کفیل (self-sufficient) ملک نہ بن سکے۔ اسرائیل کی اقتصادیات کا سب سے بڑا ذریعہ دو ہے— امریکا کی مسلسل مدد، اور بیرونی ملکوں میں رہنے والے یہودیوں کا مسلسل مالی تعاون۔ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے بھی یہی دو بنیادی اقتصادی ذرائع ہیں— امریکا کی مسلسل مدد، اور غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں کا مسلسل مالی تعاون۔

اسرائیل اور پاکستان کے اِس تجربے میں بہت بڑا سبق ہے، وہ یہ کہ صرف مذہبی نعرہ کسی قوم یا کسی ملک کو ترقی یافتہ نہیں بنا سکتا۔ کسی قوم کی تعمیر میں مذہبی نظریے کا حصہ صرف پچاس فی صد ہوتا ہے، اور بقیہ پچاس فی صد کا تعلق مادّی اسباب، خصوصاً اقتصادیات سے۔ اگر مادّی استحکام اور اقتصادی ذرائع موجود نہ ہوں تو صرف مذہبی نعرہ کسی ملک یا قوم کو ترقی کے درجے تک نہیں پہنچا سکتا۔

زندگی کا یہ اصول قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر 4 میں ارشاد ہوا ہے: **ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التي جعل الله لكم قياماً** (النساء: 5) یعنی تم نادانوں کو اپنا مال نہ دو جس کو اللہ نے تمھارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ قرآن کی اِس آیت میں اَموال کو قیام کا ذریعہ (means of support) بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالیاتی یا اقتصادی ذرائع کی اہمیت زندگی میں کیا ہے۔ اِس کے ذریعے کسی فرد یا قوم کو دنیا کی زندگی میں قیام اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔ کوئی مذہبی نعرہ کسی بھی قوم کے لیے دنیوی استحکام کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ موجودہ زمانے میں اکثر مسلم ملکوں میں اسلامی ریاست کے قیام کی تحریکیں چلائی گئی ہیں۔ مگر یہ تحریکیں ہر جگہ مکمل طور پر ناکام ہوگئیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اِن ''علم بردارانِ اسلام'' کے پاس اسلام کا نعرہ تو تھا، مگر اُن کے پاس وہ مادّی زمین موجود نہ تھی جس کے اوپر وہ اپنا مطلوب اسلامی قلعہ تعمیر کر سکیں۔

لاؤنج کے کاؤنٹر پر ہمارا بورڈنگ کارڈ لے لیا گیا تھا۔ جب اگلی فلائٹ کا وقت قریب آیا تو کاؤنٹر سے مائک کے ذریعے میرے نام کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد ائرپورٹ کا ایک آدمی وہیل چیئر

لے کر آیا۔ وہ مجھ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر روانہ ہوا۔ میرے دونوں ساتھی میرے ہم راہ تھے۔ ہم لوگ گیٹ پر پہنچے تو وہاں مسافروں کی بھیڑ انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ ائرپورٹ کا کارکن excuse me, excuse me کہتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ اِس طرح اس نے تیزی سے اِس بھیڑ کو پار کیا اور سب سے پہلے اس نے ہم لوگوں کو جہاز کے اندر پہنچا دیا۔ ہم لوگ جہاز کے اندر داخل ہو کر جب اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے، اس کے کچھ دیر بعد دوسرے مسافر جہاز کے اندر داخل ہوئے۔

یہ جہاز بظاہر ایک نیا جہاز تھا۔ اس کی ہر چیز نمایاں طور پر شان دار نظر آئی، اس کی سیٹیں بالکل شاہی تخت کے انداز میں بنائی گئی تھیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد اعلیٰ قسم کے مشروبات اور ماکولات سے تواضع شروع ہوگئی۔ مجھے ذاتی طور پر اِن چیزوں سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے مجھے تکلفات کے مقابلے میں سادگی زیادہ پسند ہے، لیکن اِس قسم کے مواقع میرے لیے ہمیشہ جنت کا بعید تعارف بن جاتے ہیں۔ میں اِس قسم کی پُر راحت چیزوں کا استقبال اکثر دعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ کرتا ہوں، نہ کہ خوشیوں اور قہقہوں کے ساتھ۔

جہاز کے اندر ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دمّام (سعودی عرب) میں ایک جاب کے تحت دس سال سے رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں اپنے گھر میں رہتا ہوں تو خوش رہتا ہوں، لیکن دمام پہنچتے ہی میں ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ تمھارے اوپر کسی نے عمل کر دیا ہے۔ میں نے جھاڑ پھونک کروائی، مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مزید پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ بیوی بچوں کے ساتھ میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے، سب میری مرضی کے مطابق ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی یہ کیفیت صرف فرضی وہم کی بنا پر ہے۔ ایسا اکثر اُن لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کو کسی وجہ سے اپنے گھر والوں سے دور رہنا پڑے۔ یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جس کو انگریزی میں ہوم سِک (homesick) کہتے ہیں۔ عربی میں اس کو 'عـلیل الشوق للوطن' کہا جاتا ہے، یعنی دوری کی بنا پر گھر کے فراق میں مبتلا۔ میں نے کہا کہ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ شعوری طور پر اِس حقیقت کو جان لیں۔ اِس کیفیت کو صرف ایک فرضی وہم سمجھ کر اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ یہ کام آپ کو

ابھی اور اسی وقت کرنا ہے۔ اگر آپ یہ کام ابھی اور اِسی وقت نہ کریں تو پھر آپ اُس کو کبھی نہیں کر پائیں گے۔ اِسی طرح کے معاملات کے لیے انگریزی زبان میں یہ مثل ہے کہ — ابھی، یا پھر کبھی نہیں:

Now, or never

دبئی سے ہوائی جہاز روانہ ہوا تو جہاز کے اندر مسلسل یہ دکھایا جا رہا تھا کہ جہاز کن ممالک کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ مثلاً سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک، وغیرہ۔ یہ دورِ جدید کا ایک انوکھا تجربہ ہے جو ہوائی جہاز کے مسافروں کو پیش آتا ہے۔ قدیم زمانے میں اِس قسم کا سفر ناممکن تھا کہ آدمی بالائی فضا میں اڑتے ہوئے مختلف ممالک سے گزرے اور دورانِ منزل پر پہنچ جائے۔ اِس اعتبار سے ہوائی جہاز گویا ایک اڑتا ہوا تخت (flying throne) ہے جو سوچنے والے کو خدا کی اتھاہ عظمت کے تصور سے لرزا دیتا ہے۔ وہ ایک طرف، خدا کی قدرت اور دوسری طرف، اپنے عجز کا لرزہ خیز تجربہ کراتا ہے۔

لیکن یہ دیکھ کر مجھ کو تعجب ہو رہا تھا کہ جہاز کے مسافر اِس عظیم ربانی تجربے سے بالکل بے خبر تھے۔ کوئی مسافر اپنے کان میں مائکروفون لگائے ہوئے میوزک سن رہا تھا، کوئی اپنی سیٹ کے سامنے لگی ہوئی اسکرین پر فلم دیکھ رہا تھا، کوئی اپنے لیپ ٹاپ (laptop) کو کھول کر اس میں مصروف تھا، کوئی کھانے اور پینے کی چیز سے محظوظ ہو رہا تھا، کوئی اپنے بچوں کو دیکھ کر ان کی محبت میں گم تھا — روحانیت کے سمندر سے گزرتے ہوئے لوگ روحانی سیرابی سے محروم تھے۔

ایسا کیوں ہوا۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ اُس وقت عین خداوندی کرشموں کے درمیان تھے، اِس کے باوجود وہ کیوں اس کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اِس قسم کا اعلیٰ تجربہ کسی کو اچانک پیش نہیں آتا۔ ایک انسان جب زمین پر ہوتا ہے، اُس وقت وہ اپنے آپ کو ایک تیار ذہن (prepared mind) بناتا ہے۔ اِس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ جب یہ تیار ذہن ہوائی جہاز میں سوار ہو کر زمین کی بالائی فضا میں پرواز کرے تو وہ اُس اعلیٰ کیفیت کا تجربہ کرے جس کے لیے اُس نے اپنے آپ کو پیشگی طور پر تیار کیا تھا۔ بلاشبہہ ہوائی جہاز کا سفر ایک اعلیٰ ربانی تجربے کا ذریعہ ہے۔ لیکن یہ اعلیٰ ربانی تجربہ صرف اُس انسان کے حصے میں آتا ہے جو ہوائی جہاز کی سواری سے پہلے اپنے آپ کو

ذہنی اعتبار سے اس کے لیے تیار کر چکا ہو— الرسالہ مشن کا مقصد ایک اعتبار سے لوگوں کے اندر اِسی قسم کی ذہنی استعداد پیدا کرنا ہے، نہ صرف ہوائی جہاز کے سفر میں، بلکہ زندگی کے ہر تجربے میں۔

جہاز کے اندر جو شاہانہ انتظامات تھے، اُن میں سے ایک یہ تھا کہ سیٹ کے سامنے ایک مخصوص اسکرین لگی ہوئی تھی۔ اِس اسکرین پر تین نشانات دکھائی دے رہے تھے— I, C, E۔ آئی کا مطلب انفارمیشن تھا، سی کا مطلب کمیونکیشن، اور ای کا مطلب انٹرٹین مینٹ۔ اسکرین پر دکھائی دینے والے اِن حروف کو ٹچ کرنے سے متعلقہ معلومات سامنے آجاتی تھیں۔ مثلاً اگر آپ آئی کے حرف کو ٹچ کریں تو ایمرٹس سے متعلق انفارمیشن اسکرین پر آجاتی تھی۔ یہ انفارمیشن مختلف شعبوں کے بارے میں تھی۔ اس میں ایک دل چسپ آپشن اپ ورڈ (upward) اور ڈاؤن ورڈ (downward) کیمرہ تھا۔ اگر آپ اپ ورڈ کیمرے کے نشان کو ٹچ کریں تو جہاز کے باہر کی خلائی تصویر اسکرین پر آنے لگتی تھی۔ اِسی طرح ڈاؤن ورڈ کے نشان کو ٹچ کرنے سے جہاز کے نیچے کی دنیا نظر آتی تھی۔ مثلاً سمندر اور پہاڑ اور صحرا، وغیرہ۔ اِس کے علاوہ بقیہ دو نشانات کمیونکیشن اور انٹرٹین مینٹ کے لیے تھے۔ مثلاً فلم، گیم، اور میوزک، وغیرہ۔ سی کے نشان کو ٹچ کرنے پر بتایا جاتا تھا کہ آپ جہاز کے اندر بیٹھے ہوئے کسی آدمی سے کس طرح ٹیلی فون پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

اِس سفر کے دوران کئی بار بریک فاسٹ اور لنچ اور ڈنر کا وقت آیا۔ ہر بار ہوائی جہاز کے عملے کی طرف سے خوب صورت چھپا ہوا مینو کارڈ (menu card) دیا جاتا تھا۔ اِس میں تفصیل کے ساتھ یہ درج ہوتا تھا کہ یہاں کھانے پینے کی کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ اِس میں طرح طرح کے ماکولات اور مشروبات درج رہتے تھے۔ اُس کو دیکھ کر مجھے قرآن کی یہ آیت یاد آتی تھی: **ولكم فيها ما تشتهي أنفسكم** (حٰمٓ السجدة: 31) یعنی اہلِ جنت کے لیے، جنت میں ہر وہ چیز موجود ہوگی جس کو وہ چاہیں۔

تاہم میں نے ایک بار بھی اِس مینو کارڈ کو نہیں پڑھا۔ وہ لوگ مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزیں لاتے تھے۔ لیکن میں اپنے مزاج کی بنا پر اُن کا استعمال نہ کر سکا۔ عام طور پر میں یہ کرتا تھا کہ براؤن بریڈ (brown bread) لے لیتا تھا اور کسی سادہ چیز سے کھا لیتا تھا، مثلاً سبزی، وغیرہ۔ کھانے

پینے اور راحت کے سامان کے بارے میں میرا یہ سادہ مزاج ہمیشہ اور ہر جگہ باقی رہتا ہے۔

حدیث میں سادگی کو مومن کا مزاج بتایا گیا ہے (البَـذاذة مـن الإیمـان)۔ ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ایمان کسی آدمی کو دنیا کی چیزوں سے اٹھا کر آخرت میں جینے والا بنا دیتا ہے۔ اُس کے دماغ میں ہر وقت یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ آخرت میں اُس سے اِن تمام چیزوں کے بارے میں باز پرس ہونے والی ہے۔ اِس معرفت کی بنا پر اُس کا وہ حال ہو جاتا ہے جس کو حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **لو علمتم ما أعلم، لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیراً**۔

جن لوگوں کے لیے پھانسی کا حکم سنایا جاتا ہے، اُن کے لیے یہ قانون ہے کہ پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے اُن کی پسندیدہ غذا اُن کے سامنے پیش کی جائے۔ چناں چہ آخر وقت میں ہر مجرم کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے سامنے ان کی پسندیدہ غذا موجود ہوتی ہے، لیکن وہ اس کو کھا نہیں پاتے۔ بلا تشبیہ، یہی معاملہ سچے مومن کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس کے سامنے تمام لذیذ غذائیں موجود ہوں، تب بھی وہ اُن سے محظوظ نہیں ہو پاتا۔ آخرت کی باز پرس کا معاملہ اُس کے لیے قاطعِ لذت بن جاتا ہے۔

دبئی سے آگے کے سفر کا ایک حصہ وہ تھا جو بحر متوسط (Mediterranean Sea) کے اوپر سے گزرتا تھا۔ جہاز جب سمندر کے اوپر سے گزرتا ہوا تیزی سے پرواز کرتا ہے تو یہ ایک عجیب منظر ہوتا ہے۔ نیچے کی طرف نظر آتا ہے کہ پانی کے جہاز سمندر کے اوپر تیر رہے ہیں، اور اس کے اوپر ہوائی جہاز تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک انوکھا منظر ہوتا ہے جو ماضی میں ہزاروں سال تک انسان کو دیکھنے کے لیے نہیں ملا تھا۔ یہ منظر اتنا زیادہ انوکھا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو معرفت کے سمندر میں غرق کر دے۔ اُس وقت میں نے سوچا کہ کتنی عظیم قدرت والا ہوگا وہ خدا جو ایسی انوکھی دنیا کو بنائے اور ایسے انوکھے انسان کو بنائے جو فطرت کے امکانات کو واقعہ کی صورت دے سکے۔

جہاز میں شیشے کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ کھڑکیاں ہمارے لیے معرفت کی کھڑکیاں بن گئیں۔ ہر منظر ہمارے لیے خدا کی عظمت کے نشان میں ڈھل گیا۔ جہاز کے اندر کی دنیا ہمارے لیے شکر کا ماحول فراہم

کررہی تھی اور جہاز کے باہر کی دنیا، خدا کے اتھاہ جمال وجلال کا مشاہدہ کرارہی تھی۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ خدا سے محبت کیسے کی جائے۔ میں نے کہا کہ یہ بے خبری کا سوال ہے۔ آپ دنیا میں آنکھ کھول کر رہنا سیکھئے تو ہر چیز آپ کو خدائی عطیہ کی صورت میں نظر آنے لگے گی۔ ہر چیز میں آپ خدا کی رحمت (blessings) کو دیکھنے لگیں گے۔ ساری دنیا انعاماتِ الٰہی کا ایک عظیم باغ بن جائے گی اور خدا آپ کو ایک منعمِ حقیقی کی صورت میں نظر آنے لگے گا۔ جب ایسا ہوگا تو آپ دیکھیں گے کہ خدا کی محبت آپ کے دل میں ایک طوفان بن کر داخل ہوگئی ہے۔

تقریباً چار گھنٹے کی پرواز کے بعد پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز جلد لارنا کا (Larnaca) کے ائرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ اِس کے کچھ دیر کے بعد جہاز آہستگی کے ساتھ لارنا کا ائرپورٹ کے رن وے پر اتر کر دوڑنے لگا۔ میں نے سوچا کہ یہ کیسا عجیب واقعہ ہے کہ سیکڑوں مسافروں کو لیے ہوئے ایک طیارہ زمین سے اوپر اٹھ کر چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر تقریباً 600 کلومیٹر کی رفتار سے اڑتے ہوئے اگلی منزل پر اتر جاتا ہے۔ یہ سارا معاملہ اتنا عجیب ہے کہ اس کو معجزہ سے کم کسی لفظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی مشین نہیں تھی، بلکہ فرشتے تھے جو ہوائی جہاز کو اڑاتے ہوئے یہاں تک لے آئے۔ یہی مطلب ہے آدم کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کرنے کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِسی کا نام معرفت ہے۔ معرفت یہ ہے کہ بظاہر اسباب کے تحت ہونے والے واقعے کو آدمی براہِ راست خدا کی طرف سے ہونے والا واقعہ سمجھے۔ ایک چیز جو بظاہر انسانی واقعہ نظر آئے، اس کا کریڈٹ وہ خداوندِ ذوالجلال کو دے سکے۔

لارنا کا میں جہاز کا بند دروازہ کھلا۔ ہم لوگ جہاز سے باہر آئے۔ یہ ائرپورٹ بحرِ متوسط کے عین کنارے واقع ہے، چناں چہ ہمارے ایک طرف ائرپورٹ کی عمارتیں تھیں اور دوسری طرف دور تک پھیلا ہوا سمندر جس کے اوپر کشتیاں اور جہاز تیرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ پورا ماحول دوبارہ خدا کی رحمتوں اور قدرتوں کا ایک انوکھا منظر پیش کررہا تھا۔ مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ ”کہو کہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کو لکھنے کے لیے روشنائی ہوجائے تو سمندر ختم ہوجائے گا، اس سے پہلے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے ساتھ اِسی کے مانند اور سمندر ملادیں“ (الکھف: 109)۔

یہاں رن وے کے کنارے خصوصی قسم کی لگژری بس پہلے سے موجود تھی۔ ہم لوگ اُس میں داخل ہوکر اس کے اندر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد بس چلتی ہوئی ائرپورٹ کے گیٹ پر پہنچ گئی۔ بس سے اتر کر ہم لوگ باہر نکلے تو پیشگی طور پر وہاں کانفرنس کے دو نمائندے ہم کو رسیو کرنے کے لیے موجود تھے۔ اُن کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا نے اپنے دو فرشتوں کو حکم دیا کہ تم فلاں مقام پر جاؤ۔ وہاں پر ایک عاجز بندہ سواری سے اترے گا۔ اُس کی معاونت کرکے تم اُس کو اس کی منزل پر پہنچاؤ۔

ہوائی اڈے کے اندر داخل ہوئے تو ہم لوگوں کو کچھ نہیں کرنا پڑا۔ مذکورہ دونوں صاحبان نے ائرپورٹ کی تمام ضروری کارروائیاں پوری کیں۔ ہمارے ساتھ کتابوں کے دس بڑے بڑے بنڈل تھے۔ اس کو بھی اُنھیں لوگوں نے کنویئر بیلٹ (conveyor belt) سے حاصل کیا اور باہر کھڑی ہوئی کار تک پہنچایا۔ ہم لوگوں کا دعوتی کام ائرپورٹ ہی سے شروع ہوگیا۔ ہمارے ساتھیوں نے لوگوں سے مل کر اُن کو پمفلٹ اور بروشر دینا شروع کردیا۔ لارنا کا ائرپورٹ دبئی وغیرہ کے مقابلے میں ایک چھوٹا ائرپورٹ تھا۔ لیکن وہ صاف ستھرا اور خوب صورت تھا۔ اس کی سادگی میرے ذوق کے عین مطابق تھی۔ میں ذاتی طور پر سادگی کو حسن کا اعلیٰ معیار سمجھتا ہوں۔ میرا یہ ماننا ہے کہ:

Simple is beautiful

جس کانفرنس میں ہم کو بلایا گیا تھا، اس کا اہتمام روم کی ایک مسیحی تنظیم نے کیا تھا۔ ائرپورٹ پر جن دو صاحبان نے ہماری کتابوں کے بنڈل کو لے جانے میں مدد کی، وہ دونوں بھی مسیحی حضرات تھے۔ یہ موجودہ زمانے کا ایک عجیب ظاہرہ ہے۔ انٹرنیشنل کانفرنس کا اہتمام دوسرے لوگ کررہے ہیں اور ہم کو وہ کھلا موقع دے رہے ہیں کہ ہم وہاں آنے والوں کو اسلامی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ یہ کامل مذہبی آزادی تاریخ میں پہلی بار آئی ہے۔ غالباً یہ اُسی معاملے کا ایک پہلو ہے جس کو قرآن میں پیشگی طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا گیا تھا: **ویکون الدین کلّه لله** (الأنفال: 39)

یہ ائرپورٹ لارنا کا شہر میں واقع ہے۔ یہاں سے ہم کو قبرص کے دوسرے شہر نکوسیا (Nicosia) جانا تھا۔ نکوسیا قبرص کا دارالسلطنت ہے۔ لارنا کا سے نکوسیا کا سفر تقریباً ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہم لوگ

ائرپورٹ سے باہر نکلے تو یہاں کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے ایک کار موجود تھی۔ یہ جدید طرز کی ایک کار تھی جس کو عام طور پر لگزری کار کہا جاتا ہے۔ لیکن میرا اپنا مزاج یہ ہے کہ مجھے کسی بھی سواری کے بجائے پیدل چلنا زیادہ پسند ہے۔ پیدل سفر میں آدمی نیچر سے براہِ راست مربوط ہو کر سفر کرتا ہے، جب کہ سواری میں سفر کرنا غیر شعوری طور پر آدمی کو اِس احساس میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ انسانی ساخت کی ایک مشین کے ذریعے سفر کر رہا ہے۔ چناں چہ مسافت اگر کم ہو تو مجھے پیدل سفر کرنا ہمیشہ زیادہ مرغوب ہوتا ہے۔

سڑک کے دونوں طرف پہاڑی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں اور وادیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پہاڑیاں زردی مائل سفید رنگ (cream-cloured) کی تھیں۔ اُن پر چھوٹے چھوٹے درخت اگے ہوئے تھے۔ ہماری گاڑی تیزی کے ساتھ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے خوب صورت مناظر حسنِ فطرت کا ایک نیا نمونہ دکھا رہے تھے۔ یہاں سڑک پر کاروں کا ہجوم نہیں تھا، البتہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچھ کاریں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ راستے میں کہیں کہیں کچھ عمارتیں سڑک کے دونوں طرف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ عمارتیں زیادہ تر مارکیٹ یا شاپنگ سنٹر کے طور پر بنائی گئی تھیں۔ کچھ رہائشی مکانات بھی نظر آئے۔ یہ مکانات سادہ اور خوب صورت تھے۔

ایک طرف دور پہاڑ پر ایک جھنڈا دکھائی دیا۔ یہ جھنڈا پہاڑ کے اوپر کندہ (engraved) تھا۔ ہمارے ڈرائیور مسٹر پیٹر (Peter) نے بتایا کہ یہ ترکی کا جھنڈا ہے۔ ترکوں نے 1974 میں قبرص کے مشرقی سمت میں داخل ہو کر اس کا 37 فی صد حصہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُس وقت سے یہ علاقہ ترکوں کے زیر قبضہ ہے۔ ترکوں کے اِس فعل کی وجہ سے قبرص کے مسیحی لوگوں کے اندر اُن کے خلاف منفی جذبات پیدا ہو گئے۔ یہ منفی جذبات دعوت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ مسلمان اگر اپنی طرف سے اِس طرح کے مسائل نہ کھڑے کریں اور پر امن انداز میں دعوت کا کام کریں تو اس کے بعد معتدل ماحول میں دعوت کا نہ رکنے والا پراسس شروع ہو جائے اور خدا کے بہت سے بندے اور بندیاں اس کی ابدی رحمتوں کے سایے میں آ جائیں۔ میں نے سوچا کہ دورِ اول میں مسلمانوں کا سب سے بڑا کنسرن یہ تھا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں سچائی کا پیغام داخل کریں۔ بعد کے

زمانے میں مسلمانوں کا سب سے بڑا کنسرن یہ بن گیا کہ وہ زمین کے اوپر اپنا سیاسی جھنڈا لہرائیں۔ اُسی کا ایک نمونہ مشرقی قبرص میں دکھائی دیتا ہے۔

نکوسیا میں انٹرنیشنل ہوٹل ہلٹن (Hilton) کی دو شاخیں ہیں — ہلٹن پارک (Hilton Park)، اور ہلٹن سائپرس (Hilton Cyprus)۔ ہم لوگوں کے قیام کا انتظام ہوٹل ہلٹن پارک میں کیا گیا تھا اور کانفرنس کی کارروائی ہلٹن سائپرس میں رکھی گئی تھی۔ ائرپورٹ سے چل کر ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہلٹن پارک پہنچے۔ جب ہم ہوٹل کے گیٹ کے سامنے اترے تو ہم نے دیکھا کہ یہ شیشے کا گیٹ ہے۔ ہمیں اُس کو کھولنا نہیں پڑا۔ قریب پہنچتے ہی وہ اپنے آپ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

ایسا میرے ساتھ بار بار ہوا ہے۔ جب بھی مجھے ایسے گیٹ کا تجربہ ہوتا ہے جو قریب پہنچتے ہی اپنے آپ کھل جائے تو اُس وقت بے اختیار میرے دل سے یہ دعا نکلتی ہے — خدایا، جب میں آخرت میں پہنچوں تو وہاں بھی میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہو کہ جنت کے دروازے اپنے آپ میرے لیے اور میرے ساتھیوں کے لیے کھلتے چلے جائیں۔ اور بلاشبہہ یہ اللہ کی رحمت سے کوئی بعید بات نہیں۔

ہوٹل پہنچتے ہی وہاں کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو کے ایک ممبر مسٹر فلپو (Philipo Sbrata) مل گئے۔ وہ ہمارے گائڈ تھے جو آخر وقت تک ہمارے ساتھ رہے۔ وہ اٹلی کی ایک یونی ورسٹی میں رسرچ اسکالر ہیں۔ یہاں کے قیام کی پوری مدت میں وہ ہمارے بہترین مددگار بنے رہے۔ ہوٹل کے کارکنوں نے ہمارا سامان اور کتابوں کے تمام بنڈل اُس کے کمرہ نمبر 343 میں پہنچا دیا۔ کانفرنس کے دوران ہمارا قیام ہوٹل کے اِسی وسیع کمرے میں تھا۔ یہیں سے ہم لٹریچر کی تقسیم کا انتظام کرتے رہے۔

ہوٹل کے جس کارکن نے ہمارا سامان ہمارے کمرے میں پہنچایا تھا، وہ رومانیہ کا باشندہ تھا۔ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ آپ کس ملک سے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا سے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ گاندھی کے ملک سے، یہ کہہ کر اُس نے دوبارہ ہاتھ ملایا اور نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ اس قسم کا تجربہ مجھے باہر کے ملکوں میں بار بار ہوا ہے۔ باہر کے لوگ انڈیا کو سب سے زیادہ گاندھی کے نام کے حوالے سے جانتے ہیں۔ گاندھی کا نام ساری دنیا میں ایک محترم نام بن چکا ہے۔ اِس کا

سبب یہ ہے کہ آج کی دنیا کے لوگ تشدد (violence) کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ جب وہ یہ سنتے یا پڑھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی نے اپنی پوری تحریک عدم تشدد (non-violence) کے اصول پر چلائی تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ یہ جدید دور کا مزاج ہے۔ آج کا انسان تشدد کرنے والے کے نام سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں امن کا کام کرنے والے کے لیے وہ اپنے دل میں احترام کا جذبہ پاتا ہے۔

ہلٹن، ہوٹلوں کی ایک انٹرنیشنل امریکی تنظیم کا نام ہے۔ یہ تنظیم 1919 میں قائم ہوئی۔ اس کی شاخیں دنیا کے 80 سے زیادہ ملکوں میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا کہ ہلٹن ہوٹل ساری دنیا میں کامیابی کے ساتھ اپنی تنظیم چلا رہا ہے۔ لیکن مسلمانوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مسلمان ایک ادارہ قائم کرتے ہیں اور پھر وہ اختلاف کا شکار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ہلٹن کی تنظیم عالمی طور پر مسلّمہ اصول (internationally accepted norms) کے مطابق قائم کی جاتی ہے۔ وہ مروّجہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے، جب کہ مسلمان عام طور پر شخصی تعلقات یا گھریلو انداز میں اپنا ادارہ قائم کرتے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں قسم کی تنظیموں میں انجام کے اعتبار سے فرق پیدا کر دیا ہے۔

16 نومبر 2008 کو دوپہر کے بعد ہم لوگ ہوٹل ہلٹن پارک پہنچے تھے۔ آج ہی کے دن شام کو ساڑھے چار بجے کانفرنس کا افتتاح (opening assembly) تھا۔ یہ افتتاح یونی ورسٹی آف سائپرس کے اسپورٹ سنٹر میں کیا گیا۔ اسپورٹ سنٹر کا یہ ہال جدید طرز پر بنایا گیا تھا اور غیر معمولی طور پر وسیع اور پرشکوہ تھا۔ کانفرنس کا یہ افتتاحی پروگرام حسب ذیل افراد کی صدارت میں کیا گیا:

Françoise Rivière, Director General Adj. of UNESCO

Siti Musdah Mulia, University Islam Syarief Hidayatullah, Indonesia

اِس افتتاحی پروگرام میں مختلف ملکوں کی اعلیٰ مذہبی اور سیاسی شخصیتوں نے خطاب کیا، مثلاً:

Dimitris Christofias, President of the Republic of Cyprus

Chrysostomos II, Archbishop of New Justinian and All Cyprus

Andrea Reccardi, Community of Sant' Egidio

Stanislaw Dziwisz, Cardinal, Archbishop of Cracow, Poland

Shear-Yashuv Coheu, Chief Rabbi of Haifa, Israel

Cresenzio Sepe, Cardinal, Archbishop of Naples, Italy

Muhammad Fathi Usman
Institute for the Study of Islam in the Contemporary World, USA

Edward Fenech-Adami, President of the Republic of Malta

Bamir Topi, President of the Republic of Albania

Filip Vujanovic, President of Republic Republic of Montenegro

قبرص کی یہ کانفرنس امن کے موضوع پر تھی۔ اس کا مقرر عنوان حسب ذیل تھا:

The Civilization of Peace, Faiths and Culture in Dialogue.

اسپورٹ سنٹر کا یہ وسیع ہال سامعین سے پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ میڈیا کے لوگ بھی بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ مقررین نے مختلف زبانوں میں اِس موضوع پر تقریریں کیں۔ وہاں ترجمے کا انتظام تھا۔ لوگ ہیڈ فون کے ذریعے اپنی مطلوب زبان میں ان کی تقریریں سنتے رہے۔ سامعین میں مقامی لوگوں کے علاوہ، مختلف ملکوں اور مختلف مذہبوں کے نمائندے موجود تھے۔ افتتاحی پروگرام کا خاتمہ اِس طرح ہوا کہ آخر میں چرچ آف سائپرس کے کچھ لوگ ایک مقرر مقام پر سامنے آئے۔ وہاں انھوں نے اپنی زبان میں کورس (corus) کی شکل میں کھڑے ہو کر ایک نظم پڑھی۔

اِس افتتاحی پروگرام کے موقع پر ہمارے ساتھیوں نے بڑے پیمانے پر لوگوں کے درمیان دعوتی لٹریچر تقسیم کیا۔ افتتاحی پروگرام کے خصوصی مقررین اور مختلف ملکوں کے اعلیٰ عہدے داروں اور مختلف مذاہب کے نمائندوں کو ہمارے یہاں کا تیار کیا ہوا قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے اسپورٹ سنٹر کے گیٹ پر کھڑے ہو کر بقیہ سامعین کے درمیان انگریزی میں چھپے ہوئے خوب صورت دعوتی پمفلٹ تقسیم کیے۔ لوگوں نے اُس کو شکریے کے ساتھ لیا، اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ لوگ لٹریچر حاصل کر رہے تھے اور Thank you, Thank you کہتے جا رہے تھے۔

سائپرس یونی ورسٹی (University of Cyprus) جہاں مذکورہ افتتاحی پروگرام ہوا، وہ قبرص کی پہلی بڑی یونی ورسٹی ہے۔ وہ 1989 میں قائم ہوئی۔ یہاں تقریباً چار ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ یہ

یہاں کی ایک مکمل یونی ورسٹی (full-fledged university) ہے۔ قبرص میں اور کئی یونی ورسٹیاں ہیں، لیکن اِن دوسری یونی ورسٹیوں میں ہر قسم کے تعلیمی شعبے موجود نہیں۔

یہاں جن لوگوں کو اسلامی لٹریچر دیا گیا تھا، اُن میں سے ایک شام کے مسیحی پادری یوحنا ابراہیم (Mar Gregorios Yohanna Ibrahim) تھے۔ اُن کا تعلق، آرتھاڈاکس میٹروپولٹن، سیرین چرچ (Orthodox Metropolitan, Syrian Church) سے تھا۔ اُن کو ہال کے اندر قرآن کے انگریزی ترجمے کا ایک نسخہ دیا گیا تھا۔ پروگرام کے خاتمے پر باہر نکلتے ہوئے اُن سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ اچھی عربی بولتے تھے۔ مولانا محمد ذکوان ندوی نے ان کو انگریزی پمفلٹ دیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ ہم کو اِس ترجمۂ قرآن کا ایک اور نسخہ دے سکتے ہیں۔ مولانا محمد ذکوان ندوی نے کہا کہ ضرور، مگر اِس وقت میرے پاس قرآن کے سارے نسخے ختم ہو چکے ہیں۔ میں ہوٹل میں آپ کو قرآن کا ایک مزید نسخہ دے دوں گا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اُس پر شیخ وحید الدین کے دستخط مطلوب ہیں۔ ہوٹل پہنچنے پر اُن کو ایک اور نسخہ دیا گیا۔ انھوں نے خوشی کے ساتھ اس کو لیا۔

افتتاحی پروگرام سے فارغ ہو کر تمام شرکاء گاڑیوں کے ذریعے ہوٹل ہلٹن سائپرس لائے گئے۔ یہاں سب کے لیے ڈنر (شام کے کھانے) کا انتظام تھا۔ ہوٹل کے وسیع لان کے اندر تمام لوگ میزوں کے کنارے بیٹھ گئے۔ مختلف قسم کے اور ہر ذوق کے کھانے یہاں موجود تھے۔ تقریباً ہر شخص کچھ بول رہا تھا۔ مگر جہاں تک میں نے اندازہ کیا، کوئی بھی شخص کانفرنس کے متعین موضوع پر گفتگو نہیں کر رہا تھا۔ ہر آدمی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا، اور درمیان میں بار بار قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ اِس میں عرب اور غیر عرب دونوں قسم کے لوگ تھے، لیکن موضوعِ گفتگو کے اعتبار سے، کسی کا کوئی استثنا نہ تھا۔ یہی منظر میں نے تمام کانفرنسوں میں دیکھا ہے۔ لوگ جس موضوع کے نام پر کانفرنس میں آتے ہیں، اُس موضوع پر وہ صرف اُس وقت بولتے ہیں جب کہ وہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہوں۔ اسٹیج کے بعد ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ کچھ اور ہوتا ہے۔

یہ طریقہ کانفرنس کے اصول کے سراسر خلاف ہے۔ منتظمین کے پروگرام کے مطابق، ہر کانفرنس کے دو حصے ہوتے ہیں — ایک، وہ جب کہ لوگ اسٹیج پر بولنے کے لیے آتے ہیں اور دوسرا، اسٹیج کے باہر۔

کانفرنس کے اصول کے مطابق یہ ہونا چاہیے کہ آنے والے لوگ دونوں صورتوں میں کانفرنس کے موضوع پر بات کریں۔ اسٹیج پر وہ زیر بحث موضوع پر تقریر کریں۔ اور اسٹیج کے باہر وہ اُس موضوع پر آپس میں ڈسکشن کریں۔ مگر میرے تجربے کے مطابق، کسی کانفرنس میں ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ وہ کانفرنسیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ٹکنکل موضوع پر کی گئی ہوں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنے والے لوگ نہ دوسروں کو کوئی مثبت چیز دے پاتے ہیں اور نہ خود کوئی مثبت چیز لے کر وہاں سے لوٹتے ہیں۔

شام کے کھانے سے فراغت کے بعد لوگوں کو دوبارہ ان کی قیام گاہوں پر پہنچا دیا گیا۔ یہ لوگ عام طور پر بسوں کے ذریعے واپس بھیجے گئے۔ لیکن منتظمین نے ہمارے لیے خصوصی طور پر ایک بڑی کار کا انتظام کیا تھا۔ یہ کار ہمارے لیے مخصوص تھی۔ جب تک ہم وہاں رہے، اِس کار کے ذریعے ہم سفر کرتے رہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ ہوٹل ہلٹن پارک میں آ گئے، جہاں ہمارے لیے قیام کا انتظام تھا۔

اِس وقت دنیا میں اقوامِ متحدہ کی ممبر شپ کے مطابق، ممالک کی تعداد 192 ہے۔ کچھ ممالک اِس کے علاوہ ہیں جو اقوامِ متحدہ کے باقاعدہ ممبر نہیں ہیں۔ قبرص کی کانفرنس میں تقریباً ایک سو ملکوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ یہ ہر مذہب اور ہر مکتبِ فکر کے لوگ تھے۔ اِن میں عالمی سطح کی بڑی بڑی شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ یہ لوگ مختلف قسم کے علمی اور مذہبی اور سیاسی میدانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر عجیب بات ہے کہ اُن میں سے کسی کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا، نہ مسلمانوں کے پاس اور نہ دوسرے مذہب کے لوگوں کے پاس، حتی کہ ان کی تقریریں بھی کنفیوژن سے بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ اِس سے سننے والوں کو کوئی پیغام نہیں ملتا تھا۔ اِس بھری ہوئی کانفرنس میں صرف ہم لوگوں کا معاملہ استثنائی معاملہ تھا۔ ہم لوگوں کے پاس اسلامی لٹریچر کا ایک بڑا ذخیرہ تھا۔ میرے ساتھی دیوانوں کی طرح اِس لٹریچر کو لوگوں تک پہنچانے میں سرگرم تھے۔

ایسا کیوں ہوا کہ لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اِس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ کسی کے لیے دوسرے لوگ اُس کا کنسرن

(concern) نہیں۔ کسی کو دوسروں سے نہ محبت ہے اور نہ خیر خواہی۔ ہر ایک کسی نہ کسی بات کو لے کر دوسروں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہے، مسلمان بھی اور دوسرے مذہب کے لوگ بھی۔ عام انسان سے محبت آج عنقا کی طرح معدوم ہو چکی ہے۔ نفرت کی اِسی عام فضا کا نتیجہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کے بارے میں خالص خیر خواہانہ انداز میں نہیں سوچتا، اور نہ کسی کے پاس خیر خواہی کا کوئی تحفہ ہے جس کو وہ دوسروں کو دینے کے لیے بے چین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ جرأت موجود نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو سچائی کا پیغام پہنچائیں۔ اِس قسم کی پیغام رسانی کے لیے جرأت درکار ہے۔ اور جہاں محبت نہ ہو، وہاں یقیناً جرأت بھی موجود نہ ہوگی۔

جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے، میں اپنے طویل تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کے سوا، ساری دنیا میں میں نے کوئی شخص نہیں پایا جو حقیقی معنوں میں انسان سے محبت کرتا ہو۔ ہر مسلم عورت اور ہر مسلم مرد کسی نہ کسی بات کو لے کر عام انسان کے خلاف نفرت میں جی رہے ہیں۔ بعض لوگ بظاہر اچھی اچھی باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے، لیکن اگر گہرائی کے ساتھ اُن کی اسکروٹنی (scrutiny) کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی دوسروں کے خلاف اپنے اندر نفرتیں لیے ہوئے ہیں۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کی ذمے داری براہِ راست طور پر موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہ نماؤں پر آتی ہے۔ موجودہ زمانے میں جب ''مغربی استعمار'' کا دور آیا تو تمام مسلم حکومتیں اس کی زد میں آ گئیں۔ اِسی طرح مسلم قومیں عمومی طور پر مغربی تہذیب کا شکار ہوئیں۔ اِس واقعے کے بعد تمام مسلم رہ نما ساری دنیا میں منفی نعرے لے کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مغربی قوموں کو دشمن کے روپ میں پیش کیا۔ یہ ایک معکوس رہ نمائی تھی۔ جن مغربی قوموں کو ہمارے رہ نما دشمن بتا رہے تھے، وہ سب ہمارے لیے مدعو کا درجہ رکھتی تھیں۔ اِن قوموں کے اوپر ہمیں خیر خواہانہ دعوت کا عمل کرنا تھا، نہ کہ اُن کو دشمن قرار دے کر اُن کے خلاف نفرت کی مہم چلانا۔ مسلم رہ نماؤں کی اِسی معکوس رہ نمائی کا یہ براہِ راست نتیجہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان دوسری قوموں کے خلاف نفرت میں مبتلا ہو گئے۔

ایک انوکھی بات یہ تھی کہ اِس کانفرنس میں میرے ساتھی کھلے طور پر اسلامی لٹریچر لوگوں کو دے

رہے تھے۔ وہ قرآن کا انگریزی ترجمہ لوگوں کو پہنچا رہے تھے، لیکن یہاں کوئی اُنھیں روکنے والا نہ تھا۔ یہ دعوتی کام یہاں مکمل آزادی کے ماحول میں ہو رہا تھا، حتی کہ کانفرنس کے لوگ حسب ضرورت ہمارے تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اِس قسم کا تجربہ مسلم جماعتوں اور مسلم اداروں میں پیش نہیں آتا۔ معروف مسلم جماعتیں اور مسلم ادارے بھی بار بار اپنے اجتماعات کرتے ہیں۔ لیکن یہ عام تجربہ ہے کہ ہمارے لوگ اگر وہاں اسلامی مرکز کی چھپی ہوئی مطبوعات لے کر جائیں تو اُن کو وہاں یہ موقع نہیں دیا جاتا کہ وہ کھلے طور پر اِن کتابوں کو تقسیم کریں۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے، لیکن نام نہاد مسلم جماعتوں اور اداروں کے درمیان آزادی کا یہ دور ابھی تک نہیں آیا۔

قبرص کی کانفرنس صحیح معنوں میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اِس میں ہر مذہب کے لوگ اور تقریباً ہر ملک کے لوگ شریک ہوئے۔ ہم لوگوں کے پاس اسلامی لٹریچر چھپا ہوا کافی تعداد میں موجود تھا۔ ہمارے ساتھی تین دن تک کتاب اور پمفلٹ اور بروشر دیوانہ وار لوگوں کے درمیان تقسیم کرتے رہے۔ اِس میں سب سے بڑا آئٹم ہمارے یہاں کا چھپا ہوا قرآن کا نیا انگریزی ترجمہ تھا۔ اِس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے انگریزی ترجموں کے مقابلے میں، اِس میں وضوح (clarity) بہت زیادہ ہے۔ اِس میں قاری کو کوئی کنفیوژن محسوس نہیں ہوتا۔ لوگوں نے بہت شوق کے ساتھ اس کو لیا۔ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو پہلی بار معلوم ہوا کہ یہاں ہم حقیقی معنوں میں انٹرنیشنل دعوہ ورک کر رہے ہیں، **لیکون للعالمین نذیراً** (الفرقان: 1) کی خبر یہاں واقعہ بنتی ہوئی نظر آئی۔

یہ انٹرنیشنل دعوہ ورک کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ اُس تاریخی انقلاب کی بنا پر ممکن ہوا جو موجودہ زمانے میں پہلی بار ظہور میں آیا ہے۔ اِس انقلاب کے اَجزا ہیں— گلوبل انٹریکشن، کمیونکیشن، پرنٹنگ پریس، مذہبی آزادی، عالمی سطح پر اُس انقلابی ذہن کا پیدا ہونا جس کو اسپرٹ آف انکوائری کہا جاتا ہے، وغیرہ۔ یہ میرے لیے اور میرے ساتھیوں کے لیے انٹرنیشنل انٹریکشن بھی تھا اور انٹرنیشنل دعوہ ورک بھی۔

17 نومبر 2008 سے کانفرنس کے دوسرے حصے کا آغاز ہوا۔ اب شرکاء کانفرنس کے 22 پینل (panel) بنادئے گئے۔ ہر پینل کا الگ الگ موضوع تھا اور ہر ایک کے لیے الگ الگ ہال مخصوص کیا گیا تھا۔

سامعین کو اختیار تھا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق، جس پینل میں چاہیں شریک ہوں۔ مثال کے طور پر فلسطین کے اِشو پر بھی ایک پینل بنایا گیا تھا۔ اِس پینل کے مقررین میں عرب بھی شامل تھے اور اسرائیلی بھی۔ اِن میں سے دو خاص مقررین کے نام یہ ہیں:

Salah A. Zuheika, Deputy Minister of Religious Affairs, Palestine

David Rosen, Grand Rabbi, President of the IJIC, Israel

اِس پینل میں دونوں جانب سے پُر جوش تقریریں ہوئیں۔ عرب مقرر نے اسرائیل کو فلسطینی المیہ کا ذمہ دار بتایا۔ اور اسرائیلی مقرر نے عربوں کو سارے معاملے کا ذمے دار ٹھیرایا۔ یہ ڈسکشن کسی مثبت نتیجے تک پہنچے بغیر ختم ہو گیا۔ ہمارے ساتھیوں نے اِس موقع پر اسلامی لٹریچر اور قرآن کا انگریزی ترجمہ لوگوں کو دیا۔ یہاں انھوں نے راقم الحروف کا تیار کیا ہوا 15 صفحات کا ایک پمفلٹ بھی تقسیم کیا جس کا ٹائٹل یہ تھا:

How to Establish Peace in the Holy Land— Ten Point Program

یہ پمفلٹ ہمارے ویب سائٹ (www.cpsglobal.org) پر بھی دستیاب ہے۔

17 نومبر 2008 کی صبح کو راقم الحروف کا پروگرام تھا۔ مجھے پینل نمبر 6 میں بولنے کا موقع دیا گیا۔ اِس پینل کی کارروائی ہلٹن سائپرس کے ہال (Achera) میں منعقد ہوئی۔ اِس پینل کے چیئر پرسن ناروے (اسکینڈی نیویا) کے بشپ (Ole Chr. M. Kvarme) کو بنایا گیا تھا۔ اِس پینل میں میرے سوا چار اور مقرر تھے۔ اِس پینل کا موضوع یہ تھا:

Prayer as a Source of Peace.

میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سب سے پہلے یہ متعین کرنا چاہیے کہ پریئر کی تعریف کیا ہے۔ میں نے کہا کہ لغت کے مطابق، پریئر کا مطلب — حقیقتِ اعلیٰ سے روحانی ربط قائم کرنا ہے:

Dictionary meaning of the 'prayer' is — establishing spiritual communion with the Higher Reality.

اِس کے بعد میں نے بتایا کہ اسلام کے تصورِ عبادت اور تصورِ روحانیت کے مطابق، انسان کا اصل کام اپنے خالق سے ربط قائم کرنا ہے۔ اِس ربط کے ذریعے آدمی کے اندر تمام اعلیٰ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

تقریر کے بعد ایک امریکن پروفیسر جان پناما (John Panama) مجھ سے ملے۔ انھوں نے میری تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اُن کو تازہ چھپا ہوا قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا جس میں راقم الحروف کا ایک مفصل دیباچہ شامل ہے۔ وہ قرآن کا انگریزی ترجمہ پاکر خوش ہوئے۔ اور کہا کہ کیا مجھے آپ اِس کا ایک اور نسخہ دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکا میں میرے ایک دوست ہیں۔ ان کی ڈائریکٹ پہنچ براک اوباما تک ہے۔ میں قرآن کے اِس نسخے کو صدر امریکا براک اوباما تک پہنچاؤں گا۔ چناں چہ انھیں اِس انگریزی ترجمۂ قرآن کا ایک اور نسخہ دے دیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں ٹیلی فون پر براک اوباما سے آپ کی بات کرانے کی کوشش کروں گا۔

ڈسکشن کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ بہت سے مقامی طلبا اور طالبات ہال کے اندر داخل ہوئے۔ اُس وقت تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ چناں چہ وہ لوگ ہال کے چاروں طرف دیوار کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت صدر جلسہ نے اعلان کیا کہ اسٹیج کے سامنے بچھے ہوئے قالین پر جگہ خالی ہے۔ کھڑے ہوئے لوگ یہاں آکر بیٹھ جائیں۔ اِس اعلان کے بعد تمام طلبا اور طالبات وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ اُس وقت مولانا محمد ذکوان ندوی لٹریچر لیے ہوئے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اِن نوجوانوں تک کس طرح دعوتی لٹریچر پہنچایا جائے۔ انھوں نے ایک طالبِ علم سے اِس سلسلے میں بات کی، پھر انھوں نے اُس طالبِ علم کو انگریزی میں چھپے ہوئے پمفلٹ (The Reality of Life) کے کچھ نسخے دیے اور مذکورہ طالب علم سے کہا کہ اِس کو اپنے ساتھوں کے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ طالب علم نے نہایت خوشی کے ساتھ پمفلٹ کو لیا اور اپنے ساتھیوں کو مطالعے کے لیے دے دیا۔

بعد کو ہمارے ساتھی نے اُن طلبا سے دوستانہ انداز میں بات کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اِس ملک میں امن کے پیام بر (ambassador of peace) ہیں۔ آپ کو لازماً یہ کام کرنا ہے کہ آپ پیس اور اسپریچولٹی کے اِس لٹریچر کو دوسروں تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں۔ اِس کے بعد اُن طلبا نے ہمارے ساتھی سے لٹریچر لے لیا اور لوگوں سے مل کر نہایت جوش وخروش کے ساتھ ان کو لٹریچر دینے لگے۔ وہ یونانی زبان میں اُن سے باتیں کر کے ہمارا دعوتی لٹریچر اُن کو پہنچا رہے تھے۔ یہ تمام طلبا اور طالبات مذہب

کے اعتبار سے کرسچن تھے۔ اِس کے باوجود انھوں نے اسلامی دعوت کے مشن میں ہمارا ساتھ دیا۔

17 نومبر 2008 کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ آسٹریا (یورپ) کے ایک یہودی ربی (Ribbi) کی صدارت میں ایک پینل ڈسکشن تھا۔ ڈسکشن کے خاتمے پر انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں جو باتیں کہیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ تمام آسمانی مذاہب کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنی مقدس کتابوں کو پڑھیں اور اُن سے رہ نمائی لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ اگر وہ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں تو وہی ان کی رہ نمائی کے لیے کافی ہو جائے گا۔

ہمارے گائڈ مسٹر فلپو اِس ڈسکشن میں موجود تھے۔ انھوں نے جب یہ بات سنی تو انھوں نے مذکورہ ربی سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں قرآن کا ایک ایسا ترجمہ موجود ہے جس میں بہت زیادہ وضوح (clarity) ہے۔ اگر آپ مسلمانوں کے اندر صحیح اسپرٹ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ اُنھیں اِس ترجمۂ قرآن کے مطالعے کا مشورہ دیں۔ اِس کے بعد مسٹر فلپو نے مذکورہ ربی سے میری ملاقات کرائی۔ اور میرے دستخط کے ساتھ قرآن کا انگریزی ترجمہ ان کو مطالعے کے لیے دیا۔

اِن واقعات سے دورِ جدید کا ایک پہلو سامنے آتا ہے۔ دورِ جدید کا ایک پہلو وہ ہے جس کو کھلا پن (openness) کہا جاتا ہے۔ آج کا انسان مذہب کے معاملے میں متعصّبانہ طرزِ فکر (biased thinking) کو پسند نہیں کرتا۔ آج کے انسان کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں رواداری کا طریقہ ہونا چاہیے، نہ کہ کٹر پن کا طریقہ۔ دورِ جدید کا یہ مزاج دعوتی کام کے لیے بے حد مفید ہے۔ اگر اپنی طرف سے کوئی منفی بات نہ کی جائے تو ہر جگہ اِس مزاج کو دعوت الی اللہ کے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اِس طرح 17 نومبر اور 18 نومبر 2008 کو مختلف موضوعات پر الگ الگ پینل ڈسکشن جاری رہے۔ ہر ڈسکشن الگ الگ ہال میں ہوتا تھا۔ پینل ڈسکشن کے موضوعات یہ تھے:

1. Peace in the Mediterranean: Faiths, conflicts and the Challenge of Coexistence.
2. John Paul II and the Prophecy of Peace
3. Xenophobia and Philoxenia: Welcoming the Stranger
4. Has Europe's Time come? (H. C. Akamas Hall)

5. The Culture of the Mediterranean
6. Prayer as a Source of Peace.
7. Earth and Humankind: a Dialogue of Faiths and Culture.
8. Israelis and Palestinians in Dialogue for Peace
9. Christians and Violence in Today's World.
10. Human Rights: 60 Years After the Declaration
11. Africa: Religions and Societies of Coexistence
12. The Legacy of the Martyrs of the 20th Century
13. Monasticism in the 21st Century
14. Faiths and Love
15. Lebanon, Working for a Civilization of Coexistence
16. Latin America, Working for a Civilization of Peace
17. Fighting Poverty to Build Peace
18. Ecumenism, Christian Unity and Peace Among Nations
19. Iraq; Working for a Civilization of Peace
20. Islam and Christianity: A Complex and Multifaceted Relationship
21. Economic Development and the Civilization of Coexistence: The Role of Religions in Asia
22. Jews and Christians: An Unavoidable Dialogue.

قبرص کی اِس کانفرنس میں 17 نومبر 2008 کی شام کو ایک پینل ڈسکشن کا موضوع یہ تھا:

Africa: Religions and Societies of Coexistence

میرے ایک ساتھی نے اُس میں شرکت کی اور وہاں لوگوں کو اسلامی لٹریچر دیا۔ اِس میں ہمارے یہاں کی مطبوعات میں سے خاص طور پر ایک کتاب (The True Jihad) بھی شامل تھی۔ حاضرین نے اس کو بہت شوق سے لیا۔ ہمارے ساتھی کا بڑا بیگ جو لٹریچر سے بھرا ہوا تھا، وہ اِس ہال میں خالی ہو گیا۔ بعد کو جب ہم لوگ یہاں سے شام کے کھانے کے لیے ہوٹل ہلٹن سائپرس کے وسیع ہال میں اکھٹا ہوئے تو ایک صاحب میرے ساتھی کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ اکامس ہال (Akamas Hall) میں جہاد کے موضوع پر ایک کتاب لوگوں کو دے رہے تھے۔ مجھے بھی اس کا ایک نسخہ چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم-کرسچن جہاد میں میرا داہنا ہاتھ کٹ گیا تھا، پھر انھوں نے دکھایا کہ کلائی سے لے کر انگلیوں تک ان کا پورا ہاتھ ایک مصنوعی ہاتھ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اسلام میں جہاد کا تصور کیا ہے۔

انھوں نے یہ بات غصہ اور نفرت کے بغیر بالکل سادہ انداز میں کہی۔ اُن کا نام یہ ہے:

Dr. James Morel Wuye, Interfaith Mediation Centre, Nigeria

میرے ساتھیوں نے ان کو اسلامی لٹریچر اور قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔

اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کا انسان کس طرح ہر بات کو جاننا چاہتا ہے۔ وہ ذاتی شکایتوں سے اوپر اٹھ کر سچائی کی دریافت کرنا چاہتا ہے۔ جدید دور کا یہ مزاج دعوت کے کام کے لیے بے حد مفید ہے۔ ضرورت ہے کہ اِس مزاج کو آخری حد تک استعمال کیا جائے اور ساری دنیا میں سچائی کا پیغام پہنچا دیا جائے۔

قبرص کی اِس تین روزہ کانفرنس کے دوران میرے ساتھیوں کا حال یہ تھا کہ وہ دن بھر وہاں کے لوگوں سے مل کر اُن سے انٹریکشن کرتے اور اُن کو اسلامی لٹریچر پہنچاتے۔ دن بھر یہ لوگ دیوانوں کی طرح کام کرتے۔ شام کو جب یہ لوگ اپنی قیام گاہ پر لوٹتے تو اُن کا حال یہ ہوتا کہ وہ بالکل تھک چکے ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر درد اور تھکاوٹ سے شل ہو چکے ہوتے اور بستر پر لیٹتے ہی اُن کو نیند آجاتی، حتی کہ مجھ سے بات کرنے کی بھی اُنھیں فرصت نہیں تھی۔ صبح کو اٹھ کر میں اور میرے ساتھی لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا سے دعا کرتے، اور پھر اِس کی پلاننگ کرتے کہ آج کے پروگرام میں کس طرح لوگوں تک دعوتی لٹریچر پہنچایا جائے۔ اِس کے بعد یہ لوگ اپنے بیگ میں لٹریچر پیک کرتے۔ اور ناشتے کے بعد ہم لوگ اپنے کمرے سے نکل کر کانفرنس کے مقام پر پہنچ جاتے۔ یہی روزانہ کا رُٹین تھا۔ صبح ہوتے ہی لٹریچر کی پیکنگ اور پلاننگ شروع ہو جاتی۔ غالب نے اپنے زمانے کے ایک ظاہرے کا حال اِن لفظوں میں بیان کیا ہے— ''ہوئی صبح اور اِدھر ہم کان پر رکھ کر قلم نکلے''۔ میرے ساتھیوں کا حال بھی ایک لفظی فرق کے ساتھ یہی تھا: ''ہوئی صبح اور اِدھر ہم بیگ میں رکھ کر کُتب'' نکلے۔ قدیم زمانے کے شاعر کا یہ حال کسبِ معاش کے لیے ہوتا تھا۔ لیکن میرے ساتھیوں کا یہ حال اشاعتِ حق کے لیے تھا۔

اِس معاملے کو دیکھ کر قرآن کی اِس آیت کا مفہوم سمجھ میں آیا: **إنّ لک فی النّهار سبحاً طویلا** (المزّمل: 7)۔ اِس تجربے سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہاں ''سبحِ طویل'' سے مراد دعوتی سرگرمی

ہے، یعنی دعوت وتبلیغ کی مجاہدانہ مصروفیت۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جس طرح آپ لوگ دوسرے انسانوں تک دعوتی لٹریچر پہنچانے کے لیے تیاری اور پلاننگ کرتے ہیں، صحابہ اِسی طرح دعوتی مہم کے لیے تیاریاں کرتے ہوں گے۔ انسانی تاریخ پر رسول اور اصحابِ رسول کا یہ عظیم ترین احسان ہے کہ انھوں نے تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار قلم کو تلوار کا قائم مقام بنا دیا۔ اب ایک آدمی قلم کے ذریعے دعوت الی اللہ کا وہ کام بخوبی طور پر کرسکتا ہے جس کو قدیم مذہبی جبر کے دور میں صرف تلوار کے زور پر کیا جاسکتا تھا۔

کانفرنس کی وسیع دنیا میں جب ہم لوگ داخل ہوئے تو وہاں ہر طرف انسانوں کا ہجوم تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش، میں اِن تمام انسانوں کو خدا کی رحمتوں کے سائے میں پہنچا سکتا۔ کاش، میں اِن تمام لوگوں کو جنت کی ابدی دنیا میں داخل کرسکتا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اِن تمام انسانوں کو ہدایت دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ تاہم ایک بات میرے اختیار میں ہے۔ وہ یہ کہ میں اِن لوگوں کی ہدایت کے لیے تڑپوں، میں ان کی ہدایت کے لیے دردمندانہ انداز میں دعا کروں۔ میں ان کی ہدایت کے لیے خدا کے سامنے آنسو بہاؤں۔ اِن حالات میں میری زبان پر بے ساختہ دعاؤں کے کلمات جاری ہوجاتے تھے — اے اللہ، تو مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو توفیق دے کہ ہم اِس بھٹکی ہوئی دنیا کو سچائی کا پیغام دے سکیں۔ دعا کے وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید ہم لوگوں کو اِسی لیے خدا یہاں لایا ہے، تاکہ ہم اُن کو دیکھیں اور دردمندی کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لیے دعا کرسکیں۔ وہ دعا جو آج سے چودہ سو سال پہلے قبرص کی اِسی سرزمین پر اصحابِ رسول نے کی تھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دعوت اور دعا دونوں ایک دوسرے کا لازمی حصہ ہیں۔ داعی جب انسانوں کی ہدایت کے لیے اٹھتا ہے تو ایک طرف اُس کو انسانوں کا سمندر دکھائی دیتا ہے۔ اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اِن تمام عورتوں اور مردوں کے دلوں میں حق کی آواز اتارنا اُس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے، جتنا کہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانا۔ دوسری طرف، اس کو شدت کے ساتھ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اِس عظیم کام کے مقابلے میں اُس کے پاس عجز کے سوا کوئی اور سرمایہ نہیں۔ اِس دوطرفہ احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر مدعو کے لیے دعا کا چشمہ ابل پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعا کے بغیر دعوت نہیں، اور دعوت کے بغیر دعا نہیں۔

جس داعی کے اندر مدعو کے لیے سچی دعانہ ہو، اس کی حیثیت صرف ایک اداکار (actor) کی ہے، جس کی کوئی حیثیت نہ انسانوں کی نظر میں ہے اور نہ خدا کی نظر میں۔

مجھے اپنی طویل زندگی میں بہت سے سفر پیش آئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ میری زندگی سفروں میں گزری ہے۔ ریکارڈ کے مطابق، صرف ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کی تعداد تقریباً 170 تک پہنچ چکی ہے۔ مگر قبرص کا سفر میری زندگی میں ایک استثنائی سفر تھا۔ یہ ایک عجیب سفر تھا جو شروع سے آخر تک گویا کہ شاہانہ انداز میں ہوا۔ اِس سے کم کسی لفظ کے ذریعے اِس سفر کی نوعیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میں دیکھتا تھا کہ ہر جگہ دوسرے لوگ لمبی لائن میں کھڑے ہوئے ہیں اور مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو کسی روک ٹوک کے بغیر ہر جگہ عزت کے ساتھ بسہولت آگے جانے کا موقع دیا جارہا ہے، وغیرہ۔

قبرص کی کانفرنس کے لیے جب دعوت نامہ ملا تو میں وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ منتظمین کے شدید اصرار کی بنا پر مجھے اس کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔ یہ ''اصرار'' بھی اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ بیرونی سفر کے لیے پہلا معاملہ ویزا (visa) کا ہوتا ہے۔ منتظمین نے نئی دہلی میں واقع قبرص کے سفارت خانے میں ایک خصوصی خط بھیج دیا۔ جس کی بنا پر ویزا حاصل کرنے کا مسئلہ استثنائی طور پر نہایت آسان ہوگیا۔ سفر شروع ہوا تو جدید ترین سہولتوں کے ساتھ دو قابلِ اعتماد اور لائق ساتھی میرے ہم راہ تھے۔ اُن کی وجہ سے سفر کے ہر مرحلے میں ایسا ہوا کہ مجھے خود کچھ نہیں کرنا پڑا۔ سارا کام دوسرے لوگ انجام دیتے رہے۔ ائرپورٹ کی رسمی کارروائی، جہاز کے اندر کے لمحات، اس کے بعد دبئی کے لاؤنج میں قیام، پھر اگلے سفر کے بعد قبرص کے ہوائی اڈّے پر تعاون کے خصوصی انتظامات، اس کے بعد ہوٹل اور کانفرنس کی کارروائیوں کے درمیان خصوصی معاملات، سب کے سب اِس طرح پیش آئے کہ میں نے کسی مرحلے میں خود کچھ نہیں کیا اور سب کچھ انتہائی اعلیٰ معیار پر انجام پاتا چلا گیا۔

اِن تجربات سے گزرتے ہوئے بار بار مجھ کو قرآن کی وہ آیت یاد آتی رہی جس میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں کچھ لوگوں کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہوگا کہ اُنھیں آسان حساب کے ذریعے جنت میں پہنچا دیا جائے گا: **فسوف يُحاسب حساباً يسيراً** (الانشقاق: 8)۔ میں بار بار اپنے لیے

اور اپنے ساتھیوں کے لیے یہ دعا کرتا رہا کہ خدایا، ہم کو آخرت کے دن حسابِ عسیر سے بچا اور ہم سب کو حسابِ یسیر کے ساتھ جنت میں داخل کر دے۔

راستے میں بار بار میں اپنے ساتھوں سے کہتا رہا کہ یہ خصوصی اہتمام کا معاملہ جو ہمارے ساتھ پیش آ رہا ہے، اس کے متعلق ہرگز یہ مت سمجھئے گا کہ یہ ہماری کسی صلاحیت کی وجہ سے ہم کو ملا ہے۔ یہ سب یک طرفہ طور پر صرف خدا کی رحمت کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ یہ بات گہرے قلبی احساس کے تحت ہونا چاہیے، نہ کہ صرف زبانی طور پر بولے ہوئے الفاظ کے ذریعے۔

18 نومبر 2008 کی شام کو اِس کانفرنس کا آخری پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام نکوسیا شہر کے قدیم حصے میں منعقد ہوا۔ اِس پروگرام کا عنوان یہ تھا— امن کے لیے دعا — Prayer For Peace

اِس پروگرام کے تحت مختلف مذہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ مقامات مقرر کیے گئے تھے۔ ہر مذہب کے لوگ اپنے مقرر مذہبی مقام پر پہنچے اور اپنے طریقے کے مطابق، عبادت کر کے وہاں امنِ عالم کے لیے دعا کی۔ مسیحی لوگ نکوسیا کے بڑے چرچ میں اکھٹا ہوئے۔ کانفرنس کے مسلم شرکا مسجد عمر (Omeriye Mosque) میں اکھٹا ہوئے۔ یہ اِس شہر کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ یہ مسجد مین میونسپل مارکیٹ (main municipal market) کے قریب والڈ سٹی (walled city) میں واقع ہے۔ ہم لوگ اجتماعی صورت میں پیدل چل کر وہاں پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں مغرب کی نماز کے لیے جماعت کھڑی ہو رہی تھی۔ یہ کافی بڑی جماعت تھی۔ ہم لوگوں نے جماعت میں شریک ہو کر وہاں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد ڈاکٹر فتحی عثمان نے مختصر طور پر عربی اور انگریزی میں تقریر کی اور آخر میں امنِ عالم کے لیے دعا کی۔

مسجد عمر ایک قدیم مسجد ہے۔ 1571 میں قبرص کے علاقے میں ترک داخل ہوئے۔ ترکی فوج کے ایک جنرل مصطفیٰ پاشا (وفات: 1580) نے یہاں موجودہ مسجد قائم کی۔ اِس مسجد کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں خلیفہ عمر فاروق نے مصر جاتے ہوئے ایک رات یہاں قیام کیا تھا۔ اِسی وجہ سے اِس کا نام ''مسجدِ عمر'' رکھا گیا۔ تاہم تاریخی اعتبار سے یہ بات غیر ثابت شدہ

ہے۔اصل یہ ہے کہ قدیم زمانے میں لوگ تفاؤل (good omen) کے طور پر اِس طرح کے نام رکھ دیتے تھے۔غالباً اِسی مزاج کی بنا پر اِس مسجد کا نام مسجد عمر رکھا گیا۔

اِس مسجد میں میرے ساتھیوں نے وہاں کے امام کی اجازت سے قرآن کے انگریزی ترجمے کے دو نسخے رکھے اور لوگوں کو دعوتی لٹریچر دیا۔ یہاں کئی پاکستانی نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ تقریباً ایک لاکھ پاکستانی قبرص میں موجود ہیں۔ یہ لوگ یہاں جاب (job) کی تلاش میں آئے ہیں۔ اِن میں سے کچھ نوجوان وہ ہیں جو قبرص کی یونی ورسٹی میں پروفیشنل کورس کر رہے ہیں۔ اِسی کے ساتھ وہ یہاں جاب بھی کرتے ہیں۔ میرے ساتھی یہاں کچھ نوجوانوں سے ملے اور ان کو انگریزی زبان میں چھپا ہوا لٹریچر دیا۔ انھوں نے اِن نوجوانوں سے دعوت کے موضوع پر بات کی اور کہا کہ آپ لوگ اِس ملک میں خدا کے سفیر ہیں۔ آپ یہاں دعوت کا کام کیجیے، آپ کو اِس کام کے لیے جتنا لٹریچر مطلوب ہوگا، وہ لٹریچر ان شاء اللہ ہم آپ کو انڈیا سے بھیج دیں گے۔

مجھے پیشگی طور پر اندازہ نہ تھا کہ قبرص میں اتنے زیادہ مسلم تارکینِ وطن (emigrants) موجود ہوں گے۔ میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانے میں دنیا کے تقریباً ہر ملک اور ہر جگہ مسلمان پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ صرف تلاشِ معاش کے جذبے کے تحت اِن مقامات پر گئے ہیں۔ تلاشِ معاش اپنے آپ میں کوئی ناجائز چیز نہیں۔ لیکن مسلمان کے لیے تلاشِ معاش صرف ایک ثانوی چیز ہے۔ موجودہ زمانے میں دس ملین سے زیادہ ایسے مسلمان ہیں جو اپنے ملکوں سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں گئے ہیں۔ یہ لوگ اگر ون مَین ٹو مشن (one man two mission) کے اصول پر اِن ملکوں میں رہیں، یعنی وہ اپنے وقت اور اپنی توانائی کا ایک حصہ دعوت کے کام میں لگائیں اور ایک حصہ کسبِ معاش کے کام میں۔ اگر وہ ایسا کریں تو اُن کا یہ ترکِ وطن اُن کے لیے ایک قابلِ اجر کام بن جائے گا، بصورتِ دیگر اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اُن کا سخت محاسبہ کیا جائے، اُن سے پوچھا جائے کہ مواقعِ معاش کو جاننے کے لیے تم چیونٹیوں کی طرح ہر جگہ پہنچے، لیکن مواقعِ دعوت کو جاننے کے لیے تم اندھے اور بہرے بنے رہے۔

مسجد عمر میں دعا اور عبادت سے فارغ ہو کر تمام لوگ اپنے اپنے مذہبی مقامات سے نکلے اور

اجتماعی صورت میں سڑک پر پیدل چلنے لگے۔ اِس سفر کی قیادت قبرص کے آرک بشپ (Chrysostomos Kykkotis) کررہے تھے۔ اِس طرح چلتے ہوئے تمام لوگ اُس مقام پر پہنچے جس کا نام یہ تھا— آرک بشپ یارڈ (Archbishopric Yard)۔ یہاں خصوصی انداز میں ایک بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اِس اسٹیج پر تقریباً ڈیڑھ سو آدمی بٹھائے گئے۔ بقیہ ہجوم آگے کے میدان میں لگی ہوئی کرسیوں کے اوپر سامعین کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں امن کے موضوع پر تین تقریریں ہوئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں نے لوگوں کو پھول پیش کئے۔ تمام مذاہب کے نمائندوں نے مل کر امن کی مشعل جلائی۔ لوگوں نے امن کے اعلامیہ (declaration) پر دستخط کیے۔ آخر میں لوگ کھڑے ہوکر ایک دوسرے سے اِس طرح ملے کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے یہ کہہ رہا تھا:

Peace be upon you, Peace be upon you.

اِس کارروائی میں رات ہوچکی تھی۔ یہاں سے واپس ہوکر لوگ اجتماعی ڈنر میں شریک ہوئے۔ ڈنر کے بعد کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو کے صدر اور قبرص کے آرک بشپ نے تمام شرکا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا، اِس کے بعد لوگ اپنی اپنی قیام گاہوں پر چلے گئے۔

''پریئر فار پیس'' کے اس آخری پروگرام کے موقع پر بھی ہمارے ساتھیوں نے دعوہ ورک کیا۔ اِس پروگرام میں عالمی سطح کے بہت سے اہم مذہبی اور سیاسی اشخاص موجود تھے۔ ہمارے ساتھیوں نے اُن کو دعوتی پمفلٹ دیے۔ قبرص کے آرک بشپ کو بھی اسلامی لٹریچر اور قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

18 نومبر 2008 کو اٹلی کی ایک بڑی ٹی وی کمپنی (Mediaset) کی ٹیم نے ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویور کا نام یہ تھا— ماریہ (Maria Cecilia Sangiorgi)۔ انٹرویو کے دوران انھوں نے اسلام اور عالمی حالات کے بارے میں مختلف سوالات کئے۔ میں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اِن سوالات کا جواب دیا۔ اُن کا آخری سوال یہ تھا کہ آج کی دنیا بہت سنگین مسائل سے دوچار ہے۔ اِن حالات میں آپ ان کی طرف سے پُرامید ہیں، یا ناامید۔ میں نے کہا میں ایک پُرامید (optimist) شخص ہوں۔ میں ہمیشہ واقعات میں امید کے پہلو دیکھتا ہوں۔ مثلاً ابھی حال میں

امریکا کے الیکشن میں سابق صدر جارج بش ہار گئے، اور بلیک صدر براک اوباما جیت گئے۔ یہ میرے لیے امید کا ایک پیغام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وائٹ ہاؤس میں وائٹ پریزیڈنٹ کی جگہ ایک بلیک پریزیڈنٹ آ گیا ہے۔ یہ ایک بڑا واقعہ ہے۔ براک اوباما نے جیت کے بعد اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ — امریکا میں تبدیلی آ گئی۔ میں کہوں گا کہ دنیا میں تبدیلی آ گئی:

Black president replaced white president in White House. After the victory, in his first speech Barrack H. Obama has said: change has come to America. I would like to say: Change has come to the world.

قبرص کی اِس کانفرنس میں حسب ذیل اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب خواتین نے بھی شرکت کی:

Asma Benkada, Programme producer of Al-Jazeera TV, Qatar

Aisha Yosuf al-Manna'i, Dean of Shariah &Islamic Studies, Qatar

Khadija Benganna, Al-Jazeera TV, Qatar.

اِن خواتین نے کانفرنس ہال میں مجھ سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ انھوں نے میری کتاب **الإسلام يتحدى** پڑھی ہے، وہ اس کتاب سے بہت متاثر ہیں۔ اول الذکر خاتون اسماء، مشہور عرب عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی اہلیہ ہیں۔ انھوں نے موجودہ مسائل پر مجھ سے گفتگو کی۔ آخر الذکر خاتون خدیجہ بن قنّہ نے الجزیرہ ٹی وی کے لیے ''اسلام اور امن'' کے موضوع پر میرا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ میرے ساتھیوں نے ان لوگوں کو دعوتی لٹریچر دیا۔

اِن خواتین کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سب نہایت ذہین خواتین ہیں اور مفید کام انجام دے رہی ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ خواتین میں غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، لیکن عام طور پر ان کی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ روایتی ماحول کی بنا پر مرد اُن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ عورتوں کو کارآمد بنانے کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے، اس کو عام طور پر ہمارے معاشرے کے مرد انجام نہیں دیتے۔ اپنے روایتی ذہن کی بنا پر وہ سمجھتے ہیں کہ عورتوں کو صرف ''خاتونِ خانہ'' بننا ہے، اِس کے سوا کوئی اور کام اُنھیں انجام نہیں دینا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں مسلم عورتوں کے بارے میں کہا تھا کہ:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے، مگر خاتونِ خانہ ہوں، وہ سبھا کی پَری نہ ہوں

اِس شعر میں ایک سخت قسم کا مغالطہ موجود ہے۔ اِس شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے لیے امکانی پوزیشن صرف دو ہے— یا تو وہ خاتونِ خانہ بنیں، یا وہ سبھا کی پری بن جائیں۔ مگر یہ تصور ایک غلط قسم کی ثنائیت (dichotomy) پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ایک تیسری زیادہ بہتر پوزیشن بھی موجود ہے، وہ یہ کہ عورت اپنے حدود کے اندر رہتے ہوئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور پھر وہ معاشرے میں کوئی دینی اور تعمیری خدمت انجام دے۔ مثلاً ایجوکیشن اور دعوہ ورک، وغیرہ۔

اِس سفر کی ایک ملاقات وہ ہے جو ہلٹن پارک کے ڈائننگ ہال کی خاتون مینجر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ پولینڈ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا نام یہ تھا— پالینا (Paulina Theodorou)۔ وہ اِس بات سے بہت متاثر تھیں کہ ڈائننگ ہال میں جو لوگ کھانے کے لیے آتے تھے، اُن میں ہم لوگ نمایاں طور پر دوسروں سے مختلف ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں نے اُن سے گفتگو کی اور ان کو اسلامی لٹریچر اور قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھنے کے لیے دیا۔ انھوں نے میرے ساتھیوں سے کہا کہ اتنی بڑی کانفرنس میں آپ ہی لوگ ہم کو اسپرچول دکھائی دیتے ہیں، ورنہ آج کل ہر آدمی صرف ایک مادّی حیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح، آپ لوگ یہاں نہ جوک (joke) چھوڑتے ہیں اور نہ قہقہے بلند کرتے ہیں۔

اُس خاتون کی گفتگو مجھ سے ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ مجھ کو اندر سے سَیڈ (sad) دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اِس کو مانا، پھر اپنے کچھ گھریلو مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان معاملات میں میرے شوہر تو پازیٹو (positive) ہیں، لیکن میں اکثر نگیٹیو (negative) ہو جاتی ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق، عورت اور مرد دونوں، ایک واحد یونٹ کے دو برابر کے نصف حصے ہیں:

Men and women are two equal halves of a single unit.

اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اور آپ کے شوہر دونوں ایک واحد یونٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب جب کہ آپ کے بیان کے مطابق، آپ کے شوہر پازیٹو ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کا نصف حصہ ابھی بھی پازیٹیو ہے۔ اب آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ آپ بقیہ نصف حصے کو، پہلے نصف حصے کے

مانند بنالیں۔ اِس بات کو سن کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ آج سے میں ایسا ہی کروں گی۔

19 نومبر 2008 کو سفر سے واپسی کا دن تھا۔ آج شام کو ہمیں واپسی کا جہاز لینا تھا۔ نماز ظہر سے فارغ ہو کر ہم لوگ ہوٹل سے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ پہلے ہم لوگ ہالہ سلطان جا کر ام حرام بنت ملحان کا مقبرہ دیکھیں گے اور اس کے بعد ائرپورٹ جائیں گے۔ یہ مقبرہ ائرپورٹ سے بہت قریب سالٹ لیک (Salt Lake) کے کنارے سمندر کے پاس واقع ہے۔ آتے ہوئے جب ہمارا جہاز لارنا کا ائرپورٹ کے قریب پہنچا تو جہاز سے ہم نے یہ مقبرہ دیکھ لیا تھا۔

19 نومبر 2008 کی سہ پہر کو ہم بذریعہ روڈ سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے۔ یہ مقبرہ بہت بڑے رقبے میں واقع ہے۔ ام حرام کے انتقال کے بعد اُس کو یہاں ایک سادہ قبر کے طور پر بنایا گیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں ایک ترکی درویش شیخ حسن آئے۔ انھوں نے 1760 میں قبر کے اوپر ایک گنبد تعمیر کیا۔ ترک اقتدار کے زمانے میں 1816 میں وہاں مقبرہ سے متصل ایک بڑی مسجد تعمیر کی گئی اور ایک بڑے رقبے میں کامپلکس کی صورت میں کئی تعمیرات کرائی گئیں۔

یونائی ٹیڈ نیشنس (United Nations Development Programme) کے تحت ہالہ سلطان کی اِس مسجد کو کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد تیسرا بڑا مقدس مقام بتایا گیا ہے:

> The mosque was described by the UNDP in Cyprus as Islam's third holiest site, after the Ka'ba in Makkah and the Mosque of the Prophet in Medina.

ہالہ سلطان کے کیمپس کے گیٹ پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ اِس بورڈ پر یہ الفاظ درج تھے:

> This project was financed with a grant from the Bi-Communal Development Programme, which was supported by USAID and UNDP and executed by UNOPS. The works were conducted in collaboration with the Department of Antiquities (Ministry of Communications and Works).

پہلے میرا خیال یہ تھا کہ یہاں صرف ایک قبر ہوگی جس کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں ایک بہت بڑا کامپلکس بنا ہوا ہے۔ ترکوں نے اس کا نام ہالہ سلطان تکیہ

(Hala Sultan Tekke) رکھا تھا، یعنی سلطانِ انبیاء کی خالہ کا مقبرہ۔ کہا جاتا ہے کہ ام حرام بنت ملحان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حلیمہ سعدیہ کی بہن تھیں۔ اِس نسبت سے ام حرام، آپ کی رضاعی خالہ تھیں۔ اِس بنا پر اس علاقے کا ترکی نام ہالہ سلطان رکھا گیا۔ یہ کامپلکس اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر بڑے پیمانے پر ایک تعلیمی یا دعوتی ادارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بروقت اس کا بظاہر کوئی خاص استعمال نہیں ہے۔ یہاں مختلف ملکوں سے ٹورسٹ آتے ہیں اور دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔

ہالہ سلطان پہنچ کر ہم لوگوں نے وضو کیا اور مسجد کے اندر داخل ہوکر دو رکعت نماز پڑھی۔ یہ ایک وسیع مسجد ہے جس کے اندر عمدہ قسم کا قالین بچھا ہوا ہے۔ مسجد کے محراب کے بائیں گوشے میں ایک دروازہ کھلتا ہے۔ اِس دروازے سے داخل ہوکر ہم لوگ اندر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اِس کمرے کے بیچ میں امِ حرام کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ پتھر کی دیوار سے گھرا ہوا ہے۔ مقبرہ کی چھت سے قبر کے اوپر تک چاروں طرف ایک موٹا غلاف آویزاں ہے۔ ام حرام کی قبر ایک سبز چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ قبر کے داہنے اور بائیں جانب پیتل کی موٹی جالیاں ہیں۔ یہاں قبر کے چاروں طرف کشادہ گیلری ہے جس پر دبیز قالین بچھا ہوا ہے۔

ہم نے وہاں ایک مسلم نوجوان کو دیکھا۔ یہ نوجوان جرمن کا رہنے والا تھا۔ وہ آج کل قبرص میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس نے مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ ام حرام کے مقبرے میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے چوکھٹ پر سجدہ کیا۔ اور قبر کی جالی پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ ہمارے ساتھیوں نے اس سے گفتگو کی اور اس کو اسلامی لٹریچر دیا۔ ام حرام کے مقبرے کے باہر ایک درخت لگا ہوا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ درخت دھاگوں اور سفید پٹیوں سے بھرا ہوا ہے۔ لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لیے یہاں درخت پر کاغذ اور کپڑے کی پٹیاں باندھتے ہیں۔ اِس قسم کی بدعتیں غالباً ترکی سے یہاں آئی ہیں۔ اگر یہاں کوئی تعلیمی یا دعوتی ادارہ قائم ہوتا تو اِس قسم کی بدعتیں یہاں فروغ نہ پاتیں۔ ہمارے ساتھیوں نے یہاں کی مسجد میں قرآن کا دو انگریزی ترجمہ اور اسلامی لٹریچر رکھا۔ وہاں اُس وقت کئی غیر ملکی ٹورسٹ موجود تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو دعوتی لٹریچر دیا۔

یہاں کی مسجد میں ہم لوگ دیر تک رہے۔ یہاں ہم نے نماز پڑھی اور دعا کی۔ ہماری دعا کا خاص پہلو یہ تھا کہ ہم نے کہا کہ خدایا، ہم کو حدیث کے مطابق، جماعتِ آخرین میں شامل کردے، یعنی اہلِ ایمان کا وہ دوسرا گروہ جو بعد کے زمانے میں سفر کرکے قبرص کے اِس جزیرے میں آئے گا اور یہاں دعوت الی اللہ کا کام کرے گا۔ ہماری اِس دعا کا پس منظر ایک روایت ہے، جو حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری میں یہ روایت چار ابواب کے تحت نقل ہوئی ہے۔ **کتاب الاستئذان** کے تحت درج شدہ روایت میں ابنِ حجر العسقلانی نے تقریباً دس صفحات پر مشتمل اس کی شرح لکھی ہے۔ اِن روایات میں جو بات آئی ہے، اُس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

امِ حرام بنت ملحان، انس بن مالک کی خالہ اور عُبادہ بن صامت انصاری کی اہلیہ تھیں۔ اُن کو رُمیصاء کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اُن کے گھر جا کر وہاں آرام کرتے تھے۔ ایک بار رسول اللہ اُن کے گھر گئے۔ وہاں دوپہر کے وقت آپ سو گئے۔ آپ نیند سے بیدار ہوئے تو آپ مسکرا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ خواب میں مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے۔ وہ تخت نشیں بادشاہوں کے مانند (**کالملوك علی الأسِرَّة**) تھے۔ وہ بحرِ اخضر (Mediterranean Sea) کا سفر کریں گے۔ امّ حرام نے کہا کہ اے خدا کے رسول، دعا کیجیے کہ اللہ مجھ کو اُن لوگوں میں شامل کردے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اُن میں شامل ہو۔ اِس کے بعد آپ دوبارہ سو گئے، پھر آپ بیدار ہوئے تو آپ مسکرا رہے تھے۔ امِ حرام کے پوچھنے پر آپ نے دوبارہ فرمایا کہ خواب میں مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے جو بحرِ اخضر کا سفر کریں گے۔ وہ تخت نشیں بادشاہوں کے مانند ہوں گے۔ امِ حرام نے کہا کہ اے خدا کے رسول، دعا کیجیے کہ اللہ مجھ کو اُن لوگوں میں شامل کردے۔ آپ نے فرمایا کہ تم پہلے گروہ میں شامل ہو، دوسرے گروہ میں نہیں (**أنتِ من الأوّلین، لستِ من الآخرین**)۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے میں صحابہ کی ایک جماعت نے 28 ہجری (649ء) میں ایک دعوتی سفر کیا۔ صحابہ کی اِس جماعت کی قیادت امیر معاویہ کر رہے تھے۔ وہ مدینہ سے روانہ ہو کر شام کے علاقے میں داخل ہوئے اور دمشق پہنچے، پھر یہاں سے مزید سفر کرکے وہ

حمص پہنچے جو بحرِ اخضر (Mediterranean Sea) کے ساحل پر واقع ہے۔ حمص تک کا سفر انھوں نے اونٹوں اور خچروں کے ذریعے کیا۔ یہاں سے انھوں نے کشتیوں پر بحری سفر کیا اور اِس طرح وہ قبرص کے ساحل پر اترے۔ یہاں کے لوگوں کے درمیان انھوں نے دعوتی کام کیا۔ ان کے دعوتی کام کے مثبت اثر کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب ایک صحابیہ ام حرام جن کی عمر اُس وقت 70 سال سے زیادہ ہو چکی تھی، یہاں اُن کا انتقال ہوا تو قبرص کے ساحلی شہر لارناکا میں ان کی قبر بنائی گئی۔ صحابیہ کے حسنِ سیرت کی بنا پر مقامی لوگ اِس قبر کو نیک خاتون کی قبر (قبر المرأة الصّالحة) کہنے لگے۔

جب ہم لوگ ہالہ سلطان کی مسجد میں تھے تو ہم نے اِس روایت کو یاد کیا۔ ہم نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ حدیث کے مطابق، امتِ محمدی کی دو جماعتوں کے لیے یہ سعادت مقدر تھی کہ وہ سفر کر کے قبرص کے اِس مقام پر آئیں اور یہاں کے لوگوں کے درمیان سچائی کا پیغام پہنچائیں۔ پہلی دعوتی جماعت میں شامل ہونے کی سعادت پریس کے دور سے قبل کچھ صحابہ اور صحابیات کو حاصل ہو چکی ہے۔ شاید ہم لوگ تاریخ کی دوسری جماعت ہیں جن کو پریس کے دور میں یہ توفیق حاصل ہوئی کہ وہ خالص دعوتی مقصد کے تحت یہاں آئے اور یہاں کے لوگوں میں مطبوعہ لٹریچر کے ذریعے بڑے پیمانے پر اسلام کا پیغام پہنچایا۔ خدایا، تو ہماری جماعت کو وہ دوسری جماعت بنا دے جس کی بشارت تیرے پیغمبر نے اپنے زمانے میں دی تھی۔

حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر قبرص کے اِس سفر کو ''غزوہ'' کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دعوتی سفر تھا، نہ کہ کوئی جنگی سفر۔ چناں چہ یہ ثابت ہے کہ جب صحابہ کی جماعت اِس مقام پر پہنچی تو وہاں کے مقامی باشندوں سے ان کی کوئی لڑائی پیش نہیں آئی۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔ اِس بنا پر داعیوں کو بھی اپنے سفر میں حفاظتی طور پر کچھ ہتھیار رکھنا پڑتا تھا، تاکہ اگر لوگوں کی طرف سے تشدد اور جارحیت کی صورت پیش آجائے تو بروقت اس کا دفاع کیا جا سکے۔ چناں چہ ساتویں صدی عیسوی میں جب ''جماعتِ اوّل'' نے یہاں کے لیے دعوتی سفر کیا تو انھوں نے احتیاطی طور پر کچھ ہتھیار بھی اپنے ساتھ رکھ لیے۔ اگرچہ عملاً اِن ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اِس کے برعکس،

موجودہ زمانے میں جب ہم لوگوں نے ''جماعتِ ثانی'' کی حیثیت سے قبرص کا سفر کیا تو زمانہ بدل چکا تھا، اِس لیے ہمارے ساتھ صرف چھپی ہوئی کتابوں کے بنڈل تھے۔ اِس کے سوا کوئی دفاعی چیز لے جانے کی ضرورت ہم کو پیش نہیں آئی۔ ہم نے وہاں کئی دن تک مسلسل طور پر دعوتی کام کیا اور کسی نے ہمارے اوپر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ہر موقع پر وہاں کے لوگ ہم کو اپنا تعاون دیتے رہے۔

19 نومبر 2008 کو میں قبرص میں بحرِ متوسط کے ساحل پر واقع اُمِ حرام بنتِ ملحان کے مقبرے کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ لارنا کا یہ مقبرہ بھی ایک مقبرہ ہے اور آگرہ کا تاج محل بھی ایک مقبرہ ہے۔ مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ تاج محل کو تاریخ کا ایک صفحہ سمجھا جاتا ہے، جب کہ ام حرام بنت ملحان صحابیہ کا یہ مقبرہ تاریخ کے ایک صفحے کی حیثیت سے نمایاں نہ ہوسکا۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ تاج محل کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کیا جاتا ہے، جب کہ صحابیہ کا یہ مقبرہ ہماری کتابوں میں صرف ''فضائل صحابہ'' کے عنوان کے تحت لکھا ہوا ہے۔

اِس معاملہ پر غور کرتے ہوئے ایک بہت بڑی حقیقت میرے سامنے آئی، ایک ایسی حقیقت جس کو خود میں نے بھی پہلی بار یہاں دریافت کیا۔ یہ حقیقت اگر چہ بہت پہلے سے موجود تھی، لیکن شعوری دریافت کے طور پر وہ غالباً پہلی بار ایک انسان کی سمجھ میں آئی۔

میں نے 1984 میں حجاز کا سفر کیا تھا۔ اُس وقت مدینہ میں ڈکتور ضیاء الرحمٰن المدنی سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام انبیاء خالص علمی اعتبار سے، غیر تاریخی پیغمبر تھے۔ آپ نے لکھا ہے کہ کسی شخصیت کے تاریخی شخصیت ہونے کا علمی معیار یہ ہے کہ معاصر تاریخ میں اُس کا حوالہ موجود ہو۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی معاصر تاریخ میں آپ کا حوالہ کہاں ملتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے پڑھا ہے کہ بعض سُریانی مورخین نے آپ کے نام کے ساتھ آپ کا حوالہ دیا ہے۔ تاہم اُس وقت یہ بات پوری طرح میرے اوپر واضح نہ تھی۔ اب اچانک یہ سمجھ میں آیا کہ پیغمبر اسلام کے تمام صحابہ اور صحابیات کا معاملہ یہی تھا کہ وہ اِس معاملے میں گویا کہ معاصر مورخین تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کا موجودہ ذخیرہ اِس اعتبار سے، پورے معنوں میں ایک تاریخی ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس ریکارڈ میں پیغمبر اسلام کے ہم زمانہ افراد آپ کے بارے میں تاریخی بیانات دے رہے ہیں۔ مگر حدیث کا یہ پہلو لوگوں پر اِس لیے مخفی رہا کہ وہ حدیث کا مطالعہ ایک ''مقدس کلام'' کی حیثیت سے کرتے رہے، نہ کہ تاریخی ریکارڈ کی حیثیت سے۔

آدمی کی یہ کمزوری ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے ذہنی مفروضہ (pre-occupied mind) کے اعتبار سے دیکھتا ہے۔ اِس ذہنی مفروضہ کی بنا پر میں حدیث کے اِس پہلو کو شعوری طور پر نہ جان سکا کہ وہ پیغمبر اسلام کی شخصیت کا ایک معتبر تاریخی ریکارڈ ہے اور تمام صحابہ اِس معاملہ میں گویا ''راویانِ تاریخ'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ دریافت میرے لیے ایک عظیم دریافت تھی۔ کیوں کہ اِس سے خالص علمی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے تاریخی پیغمبر ہیں جن کا حوالہ آپ کے معاصر مورخین نے بڑے پیمانے پر دیا ہے، اور اِن تمام مورخین کے تاریخی حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں مستند طور پر پوری طرح محفوظ حالت میں موجود ہیں۔

19 نومبر 2008 کی شام کو ہم لارنا کا ائرپورٹ پر پہنچے۔ یہاں سے ہم کو واپسی کا جہاز لینا تھا۔ میرے ساتھیوں نے ائرپورٹ پر دعوت کا کام کیا۔ انھوں نے بہت سے مسافروں سے بات کی اور ان کو اسلامی لٹریچر دیا۔ ائرپورٹ کے عملہ کو بھی انھوں نے دعوتی لٹریچر پہنچایا۔

لارنا کا سے دوبارہ ہمیں ایمرٹس ائرلائن سے سفر کرنا تھا۔ ائرپورٹ پر جو خصوصی معاملات پیش آئے، اُن میں سے ایک قابلِ ذکر معاملہ یہ تھا کہ ائرپورٹ پر مجھ کو سینئر سٹی زن ہونے کی بنا پر وھیل چئر پر بٹھایا گیا۔ ہم لوگ ائرپورٹ کے باہر پہنچے تو یہاں ایک بڑی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ پیچھے کی جانب سے اس کا دروازہ کھلا اور وھیل چئر کے ساتھ ہم کو اس کے اندر داخل کر دیا گیا۔ میرے دونوں ساتھی بھی میرے ہم راہ تھے۔ اِس کے بعد گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور وہ آگے کے لیے روانہ ہوگئی۔ اِس کے بعد گاڑی چلتی ہوئی ہوائی جہاز کے پاس پہنچی۔ یہاں مخصوص مشین کے ذریعے گاڑی کی باڈی اوپر اٹھنے لگی، یہاں تک کہ وہ ہوائی جہاز کے دروازہ کے برابر پہنچ گئی۔ دوبارہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور مجھ کو وھیل چئر پر بیٹھے بیٹھے ہوائی جہاز کے اندر داخل کر دیا گیا۔ یہاں مخصوص انداز کی شان دار کرسی موجود تھی، مجھ کو اُس کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ہم لوگ سب سے پہلے مسافر تھے جو اِس جہاز کے اندر داخل ہوئے۔ بقیہ تمام لوگ ہمارے بعد آئے۔ یہ پورا معاملہ جس طرح ہوا، اُس کو انسانی زبان میں بیان کرنا ہو تو یہی کہا جائے گا کہ یہ معاملہ گویا کہ حدیث کے الفاظ میں: **كالملوك على الأسِرَّة** کی ایک تصویر تھا۔

جہاز کے اندر میرے پاس کی سیٹ پر ایک پاکستانی مسلمان بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چئرمین ہیں۔ مادی اعتبار سے وہ ایک کامیاب انسان معلوم ہوتے تھے۔ جہاز کے پورے سفر میں میں نے دیکھا کہ وہ صرف ایک چیز میں مشغول ہیں اور وہ اُن کا لیپ ٹاپ (laptop) ہے۔ ان سے میں نے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے زیادہ دل چسپی نہیں دکھائی۔ آخر وقت تک وہ اپنے لیپ ٹاپ میں مشغول رہے اور پھر لیپ ٹاپ بند کر کے وہ دبئی میں اتر گئے۔

یہی موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ اور خوش حال لوگوں کی تصویر ہے۔ یہ لوگ سفر میں ہوں یا حضر میں، وہ ہر وقت کسی نہ کسی طور پر بس مَنی بزنس (money business) میں مشغول رہتے ہیں۔ اُن کو

یہ معلوم نہیں کہ ''منی بزنس'' سے بھی زیادہ بڑی ایک چیز ہے جس کو اُنھیں حاصل کرنا چاہیے۔ یہ زیادہ بڑی چیز ذہنی اور روحانی ارتقا ہے۔ اِس ارتقا کا ذریعہ یہ ہے کہ آدمی آس پاس کی دنیا پر غور کرے، وہ کتابوں کا مطالعہ کرے، وہ لوگوں سے علمی اور فکری موضوعات پر تبادلۂ خیال کرے، وغیرہ۔

دبئی ائر پورٹ کے لاؤنج (lounge) میں ہم لوگوں کو آتے ہوئے اور جاتے ہوئے، دونوں بار کچھ گھنٹے کے لیے ٹھیرنا پڑا۔ یہاں لاؤنج کے ایک حصے میں ایک ڈسک (desk) تھا، جس میں اخبارات اور جرائد برائے مطالعہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک عربی جریدے میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مضمون دکتور خالد النجّار کا لکھا ہوا تھا۔ اِس مضمون کا عنوان یہ تھا — أمير البيان شكيب أرسلان: جُنديّ ذو ثلاثة أهداف (امیر شکیب ارسلان: ایک مسلم سپاہی جن کی جدوجہد کے تین نشانے تھے)۔ امیر شکیب ارسلان کی جدوجہد کے یہ تین نشانے مضمون کے مطابق، حسب ذیل تھے :

الاتّحاد، التحرّر، السّير في موكب النّهضة والعلم، یعنی مسلمانوں کے درمیان باہمی اتحاد، مغربی استعمار سے آزادی، علم اور ترقی کے سفر میں قافلۂ انسانی کے ساتھ چلنا۔

امیر شکیب ارسلان 1869 میں لبنان میں پیدا ہوئے، اور 1946 میں بیروت میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ نہایت باصلاحیت آدمی تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے جب پہلی بار اُن کو دیکھا تو اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: أنا أهنّئ أرض الإسلام التي أنبتتك (میں اس سرزمینِ اسلام کو مبارک باد دیتا ہوں جس نے تمھارے جیسے انسان کو پیدا کیا)۔ امیر شکیب ارسلان، عربی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبان بھی جانتے تھے۔ انھوں نے بہت سے ملکوں کے سفر کیے۔ اُن کو اپنے زمانے کی بڑی بڑی شخصیتوں سے استفادے کا موقع ملا۔ مثلاً شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول، احمد ذکی پاشا، سید جمال الدین افغانی، وغیرہ۔ امیر شکیب ارسلان بہت زیادہ مشغول رہتے تھے۔ وہ اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے کثرت سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے بہت سے مقالات کے علاوہ تقریباً پچاس کتابیں لکھیں۔

مگر واقعات بتاتے ہیں کہ امیر شکیب ارسلان کوئی بڑا کام نہ کر سکے۔ مثلاً جدید فکری تحدیات کے مقابلے میں کوئی موثر کتاب تیار کرنا، جدید ضرورتوں کے مطابق، کوئی ایسا ادارہ قائم کرنا جو اُن کے

بعد بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتا رہے۔ جدید مسلم نسلوں میں کوئی ایسا فکر پیدا کرنا جس کے نتیجے میں وہ نئے مواقع کو سمجھیں اور اُن کو بڑے پیمانے پر استعمال کریں، وغیرہ۔ ان کی اِس ناکامی کا سبب میرے نزدیک صرف ایک تھا، وہ یہ کہ انھوں نے تین مختلف نشانوں کو اپنی زندگی کا نشانہ بنالیا۔

اِس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر کرنے کے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ لیکن آدمی کو گہرے غور وفکر کے ذریعے یہ دریافت کرنا پڑتا ہے کہ کسی وقتِ خاص میں کرنے کا بنیادی کام کیا ہے، یعنی وہ کام جس میں محنت کرنے سے دوسرے کام اپنے آپ انجام پاتے چلے جائیں۔ امیر شکیب اُس بنیادی کام کو دریافت نہ کرسکے۔ اِس لیے ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود ان کی کوششیں بکھر کر رہ گئیں۔

مذکورہ مضمون میں امیر شکیب ارسلان کے تذکرے کے تحت یہ الفاظ درج ہیں: وكان شكيب أرسلان يرى أن العدوّ الأوّل للإسلام والمسلمين هو الجهل (امیر شکیب ارسلان یہ سمجھتے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک ان کی جہالت ہے)۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ بات انھوں نے گہری شعوری دریافت کے نتیجے میں کہی تھی۔ اگر حقیقی معنوں میں یہ ان کی دریافت ہوتی، تو وہ اپنی ساری زندگی اِسی ایک کام میں لگا دیتے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ''مغربی استعمار'' کے خلاف لکھنے اور بولنے میں صرف کردیا، جو نتیجے کے اعتبار سے سرتاسر ایک بے فائدہ کام تھا۔

میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ ایک کام کرنے کے لیے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلم رہ نما اِس حقیقت سے بے خبر رہے۔ تقریباً ہر مسلم رہ نما کا یہ حال ہوا کہ وہ بیک وقت مختلف نشانوں کی طرف دوڑتا رہا۔ اِن تمام رہ نماؤں کے اوپر یہ مثل صادق آئی کہ — جو آدمی کئی خرگوشوں کی پیچھے دوڑے، وہ ایک کو بھی نہیں پکڑ سکتا۔ اِن رہ نماؤں سے یہ غلطی اِس لیے ہوئی کہ وہ اِس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ ہر صورتِ حال میں مختلف قسم کے مسائل ہوتے ہیں۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو مسائل (problems) کو نظر انداز کرے اور مواقع (opportunities) کو استعمال کرے۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں شاید کوئی بھی مسلم رہ نما فطرت کے اِس اصول کو سمجھ نہ سکا۔ شاعر کے الفاظ میں ہر ایک کا انجام یہ ہوا — خوش درخشید، ولے شعلۂ مستعجل بود

دبئی سے دہلی کے لیے دوبارہ عرب ایمرٹس کی فلائٹ (EK 510) سے واپسی ہوئی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ اِس لیے زیادہ وقت کھانے پینے یا سونے میں گزرا، کوئی خاص واقعہ درمیان میں پیش نہیں آیا۔ 20 نومبر 2008 کی صبح 9 بجے ہمارا جہاز دہلی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترگیا۔ میں جہاز سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ ائرپورٹ کا آدمی وہاں دوبارہ وہیل چیئر لیے ہوئے کھڑا ہے۔ وہ مجھ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر تیزی سے لے چلا۔ میرے دونوں ساتھی بھی میرے ہم راہ تھے۔ ہم لوگوں کو ونڈو پر پہنچ کر ضروری اندراجات کروانا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عام ونڈو پر کافی بھیڑ ہے۔ لیکن مجھ کو نئے راستے سے چلا کر ایک خاص ونڈو پر لے جایا گیا جو کہ خالی تھی۔ ہم تینوں کے کاغذات کو فوراً کلیر کر دیا گیا اور ہم جلد ہی ائرپورٹ سے باہر آ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، اِسی قسم کا زیادہ سخت مرحلہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ اُس وقت تو میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ اِسی طرح آسانی کا معاملہ فرما۔

ہم لوگ ائرپورٹ سے باہر نکلے تو ہمارے یہاں کے ایک کارکن مسٹر اشوک گاڑی کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ہم لوگ دوبارہ نظام الدین ویسٹ پہنچ گئے۔

15 نومبر 2008 کی شام کو میں دہلی سے قبرص کے لیے روانہ ہوا تھا اور 20 نومبر 2008 کو میں دوبارہ دہلی واپس آ گیا۔ جب میں اِس سفر پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ پورا سفر ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ مولانا اقبال احمد سہیل (وفات: 1955) نے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ اِس نظم کا عنوان رویاءِ صادقہ (سچا خواب) تھا۔ اِس نظم کے آخری دو شعر یہ تھے، جو کہ مجھے اپنے حسب حال معلوم ہوتے ہیں:

محوِ نظارہ تھا میں، ناگاہ آئی یہ صدا　　آ گئی صبحِ مسرت، سونے والو ہوشیار

یہ صدا سن کر یکایک میری آنکھیں کھل گئیں　　پھر وہی میں، اور وہی ہنگامۂ لیل ونہار

(یہ سفرنامہ مولانا محمد ذکوان ندوی کے تعاون سے تیار کیا گیا)۔